رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

74 واں سال، ساتواں شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

بچوں کا محبوب رسالہ

تعلیم و تربیت

نومبر 2014

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ایک مشہور بادشاہ کہیں جا رہا تھا کہ راستے میں اسے ایک بوڑھا ملا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا: ''بڑے میاں! تمہاری عمر کتنی ہوگی؟'' بوڑھے نے جواب دیا: ''جہاں پناہ! خدا آپ کی عمر دراز کرے اور خوب دولت سے نوازے، اس گناہ گار کی عمر صرف چار سال ہے۔''

بادشاہ نے کہا: ''ہیں؟ یہ بڑھاپا اور اتنا جھوٹ؟ تمہاری عمر 80 برس سے کم نہیں ہو سکتی۔'' بوڑھے نے جواب دیا: ''جہاں پناہ! حضور والا کا اندازہ بہت درست اور بالکل صحیح ہے، مگر 80 میں سے 76 سال اس عاجز نے یوں ہی گنوا دیے جن میں صرف میں اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا رہا اور سمجھتا رہا کہ یہی میرا کام ہے۔ اس کے سوا کوئی نیکی کمائی نہ کسی غریب کی خدمت کی۔ اب چار سال سے یہ عقل آئی ہے کہ ہم لوگ فقط اپنے ہی لیے پیدا نہیں ہوئے بلکہ دوسروں کا بھی ہم پر حق ہے۔ اب میں اس بات پر عمل کر رہا ہوں۔ اسی لیے اصل عمر صرف 4 سال ہی کی سمجھتا اور گنتا رہا، باقی فضول۔''

پیارے بچو! بوڑھے نے کیسی اچھی بات کہی ہے۔ جب تک آدمی اپنے کام کو نہ سمجھ لے، آدمیوں میں نہیں گنا جا سکتا۔ بزرگی عقل پر ہے، عمر پر نہیں۔ سخاوت دل سے ہوتی ہے، مال داری پر نہیں۔ جو لوگ اس بات کو پہلے سے سمجھ لیں، وہ ہمیشہ کم زوروں اور غریبوں کی مدد کر کے نیکیاں حاصل کر لیتے ہیں اور اپنی زندگی کا حقیقی مقصد پا لیتے ہیں۔

اس سال بھی وطن عزیز میں بدترین سیلاب آیا ہوا ہے جس سے بہت سے افراد کی اموات ہوئیں، کھڑی فصلیں تباہ ہوئیں۔ لاکھوں گھر ملیامیٹ اور مال مویشی بہہ گئے۔ مصیبت کی اس گھڑی میں انفرادی اور اجتماعی طور پر آپ بھی اپنے مصیبت زدہ بھائیوں کی دل کھول کر مدد کریں جو آپ کی امداد کے منتظر ہیں۔

9 نومبر شاعر مشرق، حکیم الامت اور مصور پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کا یوم پیدائش ہے۔ آپ نے دو قومی نظریہ کی روشنی میں برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک آزاد اور خود مختار وطن کا تصور پیش کیا۔ اسی لیے آپ کو مصور پاکستان کہتے ہیں۔ آپ کو نوجوانوں سے خاص محبت تھی۔ وہ نوجوانوں سے بہت سی امیدیں رکھتے تھے اور اپنی شاعری میں اسے شاہین کے نام سے مخاطب کرتے۔ علامہ اقبالؒ کی تعلیمات ہمیں خودداری، عمل، محبت اور اتحاد جیسے جذبے سے روشناس کراتی ہیں۔ امید ہے ہمارے پیارے نوجوان ساتھی اقبال کی تعلیمات اور نظریات پر عمل پیرا ہو کر ایک مرد مسلمان اور مرد مومن کی حقیقی تصویر بننے کی کوشش کریں گے۔

آپ سے ایک ضروری بات بھی کہنی ہے کہ سلسلہ ''آپ بھی لکھیے'' میں جب بھی کہانی بھیجیں، اپنا پورا پتا اور ٹیلی فون نمبر بھی ضرور لکھیں تاکہ انعام کے حق دار کو انعام موصول ہو جائے اور ہمیں دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ کوئی کہاوت، مقولہ، ضرب المثل اور تاریخی کہانی نقل کر کے مت بھیجیں۔ خود لکھیے، اپنے دماغ سے سوچیے۔ امید ہے ہمارے ساتھی ہماری اس گزارش پر ضرور عمل پیرا ہوں گے۔ اس ماہ کا رسالہ پڑھیے اور اپنی آرا اور تجاویز سے بھی آگاہ کیجیے۔ خوش رہیں، شاد اور آباد رہیں۔ اچھا اب اجازت دیں، باقی آئندہ......

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام

اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر

سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: علامہ اقبالؒ

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
Ph: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail: tot.tarbiatfs@gmail.com
tot.tarbiatfs@live.com

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائد اعظم، لاہور۔

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت بذریعہ بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر، ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک)=850 روپے
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ (ہوائی ڈاک سے)=2400 روپے
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے)=2800 روپے

قیمت فی پرچہ 30 روپے

پیارے بچو! قرآن پاک میں تیسرے سیپارے کے شروع میں دس جملوں پر مشتمل ایک آیت ہے۔ اسے آیت الکرسی کہا جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلیلہ اور قدرت عظیمہ کو بیان کیا گیا ہے۔ احادیث مبارکہ میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کے بہت سے فضائل اور برکات کو بیان کیا ہے۔

1- حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا: ''قرآن کریم کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟'' انہوں نے جواب دیا: ''اللہ جل شانہٗ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی زیادہ علم ہے۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جملہ (کہ قرآن کریم کی کون سی آیت سب سے عظیم ہے؟) بار بار دہرایا۔ حضرت اُبی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''آیت الکرسی۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا اور ارشاد فرمایا: ''اے ابو المنذر (حضرت اُبی رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) تمہیں یہ علم مبارک ہو (یعنی اس علم کی برکت سے تمہیں قرآن کریم کی عظیم ترین آیت کا پتا چل گیا)۔''

(مسلم، باب فضل سورۃ الکھف وآیۃ الکرسی: 810)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت الکرسی قرآن کریم کی عظیم ترین آیت ہے۔

2- ایک حدیث میں ہے کہ جب تم رات کو سونے کے لیے اپنے بستر پر جاؤ تو آیت الکرسی پڑھ لو۔ اگر ایسا کرلوگے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے اوپر ایک نگران مقرر ہو جائے گا اور تمہارے قریب شیطان نہ پھٹکے گا۔ (بخاری، کتاب الوکالۃ: 2311)

3- حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سورۂ بقرہ میں ایک آیت ہے جو قرآن پاک کی آیتوں کی سردار ہے، اسے کسی ایسے گھر میں پڑھا جائے جس میں شیطان ہو تو شیطان وہاں سے نکل بھاگتا ہے۔''

(مستدرک حاکم، کتاب فضائل القرآن، اخبار فی فضل سورۃ البقرۃ: 2059)

سورۂ بقرہ کی آیت نمبر 255 وہ عظیم آیت ہے جس کو حدیث میں قرآن پاک کی آیتوں کی سردار کہا گیا ہے اور اس کی ایک خاص فضیلت یہ بیان کی گئی ہے کہ جس مکان میں یہ سورۃ پڑھی جائے تو اس سے شیطان بھاگ جاتا ہے۔ اسی طرح رات سوتے وقت اس کو پڑھنے سے فرشتہ حفاظت کے لیے مقرر ہو جاتا ہے۔ گویا آیت الکرسی شیطان کے اثرات، جنات اور بھوت پریت کی شرارتوں سے محفوظ رکھتی ہے۔

4- حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص ہر (فرض) نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھ لے اس کو جنت میں جانے کے لیے موت ہی آڑ بنی ہوتی ہے اور جو شخص اس آیت کو اپنے بستر پر لیٹتے وقت پڑھ لے تو (اس کی برکت سے) اللہ تعالیٰ اس کے گھر میں اور پڑوسی کے گھر میں اور آس پاس کے گھروں میں امن رکھے گا۔

(شعب الایمان للبیہقی، فصل فی فضائل السور والآیات: 2174)

پیارے بچو! کس قدر با برکت ہے یہ آیت کہ اس کے پڑھنے سے گھر، مال و دولت اور پڑوسیوں کے مکان تک محفوظ ہو جاتے ہیں، تو پھر اس کی برکات حاصل کرنے میں ہرگز پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔

☆☆☆

شاعر مشرق مفکرِ اسلام ڈاکٹر اقبال کی شخصیت آج دُنیا میں موجود نہیں لیکن ان کی فکر آج بھی پڑھے لکھے مسلمانوں کے خیالات کی راہ نمائی کر رہی ہے۔ برصغیر کے قلب و ذہن کو احساسِ کمتری سے پاک کر کے اقوام عالم میں ان کا تشخص اجاگر کرنے والے راہبر اقبال کے ان اوصاف کا احساس ہمیں اس وقت ہوتا ہے جب ہم ان کی سوچ اور فہم پر نظر ڈالتے ہیں اور ان کے تعمیری اندازِ فکر، گہری بصیرت کے واقعات سے متعارف ہوتے ہیں، بالخصوص رسالتِ مآب ﷺ سے والہانہ عشق کے حوالے سے ان کی فکر پر غیر بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ گزشتہ صدی میں برصغیر کی تاریخ میں اقبال سے زیادہ ہوش مند مسلمان اور عاشقِ رسول ﷺ پیدا نہیں ہوا۔

اقبال کا کہنا ہے کہ اگر عشقِ رسول ﷺ کی کارفرمائیاں نہ ہوتیں تو دُنیا صبرِ حسین کی فقید المثال (بے مثال) ضیا پاشیوں (روشنی پھیلانا) سے آشنا نہ ہو سکتی تھی۔ بدر و حنین کے معرکوں میں کامیابیاں حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔ سومنات کے لات و منات پاش پاش نہ کیے جا سکتے تھے اور اسلام کو وہ وسعتیں نہ مل سکتی تھیں جو تاریخ کے حوالے سے آج سامنے آتی ہیں۔ اقبال کی نگاہوں میں دُنیا کی ہر چیز عشقِ رسول ﷺ کے بغیر بے مصرف و بے معنی ہے۔ اقبال رسالتِ مآب ﷺ کی ذاتِ گرامی سے وفاداری، آپ کی اتباع اور تابع داری کے حوالے سے یہ پیغام دیتے نظر آتے ہیں:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

عشقِ رسول ﷺ کے ضمن میں اقبال سے وابستہ یوں تو بے شمار واقعات ہیں لیکن چند واقعات ایسے ہیں جو بے حد دل نشیں، روح پرور ہیں اور ہر مسلمان کے دل کو راحت سے سرشار کرتے اور زندگی کو حرارت عطا کرتے ہیں۔

ایک روز ایک نوجوان اقبال کے ہاں آیا اور دورانِ گفتگو جب پیغمبر آخرالزماں حضرت محمد ﷺ کا ذکر آیا تو اس نوجوان نے حضور کا اسمِ مبارک معروف تعظیمی القاب و آداب کے بغیر ''محمد صاحب'' کہہ کر پکارا تو اقبال کا چہرہ ایک دم تبدیل ہوگیا اور شدید ناگواری کے باعث چپ سی لگ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ نوجوان ماحول میں تناؤ کو بھانپ کر اٹھ کر چلا گیا۔ یکایک اقبال کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ انہوں نے سخت بے کلی اور گہرے اضطراب کے ساتھ حاضرینِ مجلس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''ہماری قوم کا انجام کیا ہوگا، جس کے نوجوان مقامِ رسالت ﷺ سے بے خبر اور نابلد ہیں اور نہیں جانتے کہ محمد عربی ﷺ کے مقام کو نہ پہچان کر کس گم راہی میں گرتے جا رہے ہیں۔''

......☆......

اقبال گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد یورپ کے کئی ملکوں سمیت فلسطین و مصر کی سیاحت کرتے ہوئے لاہور پہنچے تو ان کے ایک بے تکلف دوست نے کہا کہ اگر آپ اتنی لمبی سیاحت کے ساتھ رسول پاک ﷺ کے روضۂ مبارک کی زیارت بھی کر آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس بات پر علامہ کی آنکھیں چھلک اُٹھیں اور وہ گلوگیر آواز میں بولے:

''میں کس منہ سے روضۂ اطہر پر جاتا'' اور پھر وہ دیر تک روتے رہے اور ان کا وجود کپکپاتا رہا۔

علامہ اقبال کا عشقِ رسول ﷺ ساری زندگی پر حاوی نظر آتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ تب معلوم ہوئی جب علامہ کی والدہ محترمہ امام بی بی کے انتقال کے موقع پر رو رو کر ایک بات دہراتے۔ "بے جی آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا۔" دوستوں نے علامہ سے وضاحت چاہی تو آپ نے فرمایا، جب میں چھوٹا تھا تو میرے والد ڈپٹی وزیر بلگرامی کے ہاں ملازم تھے جو انگریز سرکار کی ملازمت کرتے تھے۔ اس وجہ سے میری والدہ کو شبہ ہوا ہے کہ ان کی آمدنی شرعاً مشکوک ہے، لہٰذا انہوں نے اپنا زیور بیچ کر ایک بکری خرید لی اور مجھے اس کا دودھ پلانے لگی، پھر میرے والد نے بھی بلگرامی کی نوکری چھوڑ دی۔

یہ بات اچھی طرح میرے فہم میں آ گئی کہ رزقِ حلال ایمان کی جان ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں یہی میری والدہ کا مجھ پر احسان ہے۔ انہوں نے مجھے رزقِ حلال سے پروان چڑھایا۔

سالک کہتے ہیں کہ میں اکثر ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کی باتوں سے مستفید ہوتا، اس وقت ان کی عمر چالیس برس سے کم تھی۔ آپ اسلامیات کے وسیع مطالعے اور قرآنِ پاک کے تدبر میں مصروف رہتے۔ آپ کی طبیعت میں سوز و گداز تھا۔ میں نے بار بار دیکھا کہ جوانی کے دور میں جب بھی دورانِ گفت گو نبی آخرالزماں ﷺ کا ذکر آتا تو آپ اتنے آب دیدہ ہوتے کہ گفت گو جاری رکھنا محال ہوتا۔

سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ علامہ کی ایک بڑی اور دیرینہ آرزو حرم پاک اور روضۂ رسول ﷺ کی زیارت تھی۔

1932ء میں انگلستان سے واپسی پر کانفرنس اسلامیہ میں شرکت کے لیے بیت المقدس تشریف لے گئے تو سفرِ حجاز کا سامان تقریباً مکمل ہو چکا تھا مگر علامہ نے فرمایا کہ شرم آتی ہے کہ ضمناً دربارِ رسول ﷺ میں حاضر ہوا جائے۔ 1937ء میں جب طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو مختلف جہازران کمپنیوں سے خط و کتابت شروع کی تاکہ فریضہ حج کے بعد مدینہ منورہ کی زیارت سے فیض یاب ہو سکیں۔ رفتہ رفتہ اقبال نے عالمِ تصور میں اس مقدس سفر کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ انہوں نے خیال ہی خیال میں احرامِ سفر باندھا اور ارضِ پاک روانہ ہو گئے۔ کبھی صحن حرم کعبہ میں اپنی بے تابی کا اظہار کرتے، کبھی دیارِ حبیب ﷺ میں پہنچ کر ان کی بے چین روح کو تسکین و قرار کی دولت ہاتھ آتی۔

اقبال عملی زندگی میں ایک معتدل اور سادہ دل مسلمان تھے جو کسی سازش یا سیاسی اکھاڑ پچھاڑ کے قائل نہ تھے لیکن جب مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنی خود ساختہ "نبوت" کی تبلیغ شروع کی اور عقیدہ ختمِ نبوت پر ضرب لگانے کی جسارت کی تو اقبال جیسے عاشقِ رسول ﷺ اور دردمند مسلمان سے برداشت نہ ہو سکا۔ چناں چہ قادیانیت کے بارے میں ان کی سخت گیر پالیسی اور اس سے برملا اظہارِ نفرت و بے زاری جس کے پس منظر میں ان کی دینی غیرت، اسلامی حمیت اور حضور نبی اکرم ﷺ سے گہری الفت کارفرما تھی، کھل کر سامنے آ گئی۔ رسول پاک ﷺ کی ختم المرسلین جو ایک حقیت ہے اور ہر مسلمان کے ایمان کا جزو ہے اس کے خلاف کسی بھی کوشش پر اقبال جیسے عاشقِ صادق کا خاموش رہنا قطعی ناممکن تھا۔ ان کی بصیرت اور غیرت ایمانی نے اس فتنے کی سرکوبی اور اس کے عیاں و نہاں (چھپے ہوئے) مقاصد سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھا۔ انہوں نے یہ بات واضح کی کہ قادیانیوں کا اسلام سے کوئی رابطہ نہیں اور خود ان کے عمل کی روشنی میں اسلام سے ان کے رسمی تعلق کو ختم کر کے انہیں ایک غیر مسلم جماعت قرار دیا جائے۔

اقبال اگر کسی گستاخِ رسول کو برداشت نہ کر سکتے تھے تو ایسے لوگ ان کے دل میں بستے تھے جو ناموسِ رسالت ﷺ پر فدا ہونے والے تھے۔ خاص طور پر برصغیر میں شمع رسالت پر قربان ہونے والے پروانوں میں غازی علم الدین شہید اور غازی عبدالقیوم شہید کی جاں نثاری اور سرفروشانہ شہادت سے بہت متاثر تھے۔ ان دونوں کے لیے اقبال کا خراج عقیدت وہ نقشِ جمیل ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

اقبال کو حضور سرورِ دو عالم ﷺ سے جو عقیدت تھی وہ آج بھی محبت کا ایک استعارہ ہے۔ اقبال کے دل کی تسکین کا واحد ذریعہ حضور کا اسم مبارک ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو امت کے دلوں میں زندگی بن کر دوڑ رہی ہے اور جس سے ہماری جان

راحت آشنا ہوتی ہے۔ وہ اپنی امت کے قافلے کے راہبر و سالار ہیں جن کی قیادت میں منزل سامنے ہے۔

اقبال اس حقیقت کو "بانگِ درا" میں یوں بیان کرتے ہیں:

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام و جاں ہمارا

اور حضور نبی اکرم ﷺ کی شان میں محبت سے سرشاری کا انداز "بالِ جبریل" میں یوں جھلکتا ہے۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

حصولِ پاکستان کی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز قراردادِ لاہور (1940ء) سے ہوتا ہے۔ علامہ اقبال اس سے دو سال قبل 1938ء ہی میں فوت ہو چکے تھے۔ اس اعتبار سے پاکستان کی تحریک اور اس کے حصول کی سات سالہ جدوجہد میں بہ ظاہر علامہ اقبال کا کوئی کردار نظر نہیں آتا لیکن یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ برِاعظم کی ملتِ اسلامیہ کی بھلائی، بیداری اور آزادی کے سلسلے میں اقبال کا ذہن ابتدا ہی سے بہت صاف تھا۔ وہ ایک آزاد مسلم مملکت، ہندوستان کو اسلام کا گہوارہ بنانے کے آرزومند تھے۔ لکھتے ہیں:

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کا بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بل کہ ہمارا اوّل مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقت ور بن جائیں۔"

برِصغیر میں احیائے اسلام کے سلسلے میں علامہ کے کام کے تین مرحلے ہیں اور ان کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ان میں پہلا مرحلہ وہ ہے جب اقبال نے مسلمانوں میں "مسلمان" ہونے کا احساس پیدا کرنے اور انہیں خوابِ غفلت سے جگانے کی کوشش کی۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے دو قومی نظریے کو ایک مستقل اصول کے طور پر پیش کر کے پاکستان کے لیے ٹھوس نظریاتی بنیادیں فراہم کیں۔ تیسرے مرحلے میں علامہ نے خطبہ الٰہ آباد کے ذریعے مسلم لیگ کو ایک علیحدہ اسلامی مملکت کی راہ سجھائی اور خود لیگ میں شامل ہو کر براہِ راست اسے فیض پہنچایا۔ تحریکِ پاکستان کے پہلے اور ابتدائی مرحلے میں اقبال نے مسلمانوں کو ان کا مسلمان ہونا یاد دلایا۔ ان کی اس دور کی شاعری اور نثر میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کے تذکرے اور عظمتِ رفتہ کے قصے ملتے ہیں۔

علامہ مرحوم کی انہی دو آرزوؤں کو بعد میں تحریکِ پاکستان کا نام ملا جو آخرکار قیامِ پاکستان پر منتج (نتیجہ نکلا) ہوئی۔

حرم کی عظمت و حرمت کے لیے علامہ اقبال کی اہم ترین نصیحت یہ ہے کہ روئے زمین کے تمام مسلمان خواہ کسی ملک میں بھی ہوں اور کسی رنگ میں بھی ہوں، متحد ہو جائیں۔ ان کا اتحاد ہی ان کے استحکام کا باعث اور حرم کی پاسبانی کا ضامن ہو سکتا ہے، علامہ نے بلیغ اور بلند الفاظ میں فرمایا:

ایک ہو مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے تابخاکِ کاشغر

☆☆☆

اقبال کے حضور

شاعرِ خوش نوا شاعرِ ذی حشم
سب تجھے یاد کرتے ہیں اہلِ قلم

تو نے شاہیں کا ہم کو تصور دیا
تیرے شاہیں کبھی اے کاش بن جائیں ہم

یہ وطن کا تصور بھی تجھ سے ملا
جس سے قائم ہے اب تک ہمارا بھرم

ہم جو دُنیا میں بکھرے ہوئے لوگ تھے
آج اقوامِ عالم میں ہیں محترم

تیرے شعروں میں حکمت ہے دانائی ہے
تیری فکرِ رسا مدحِ شاہِ امم

تیری فکرِ رسا کی بدولت ہمیں
مل گئی یہ زمیں رشکِ باغِ ارم

کرامت بخاری

میجی لن اور اس کا بیڑہ۔ جلکوٹ اور جلکو ٹے شاہراہ ریشم اور اُس کا حسن و جمال

میرے سر پر اس وقت اسلام آباد کے آسمان کی چھت تھی۔ میرے پیٹ میں اضطراب، بے چینی اور اندیشوں کے گولے ادھر ادھر لڑھک رہے تھے۔ میں ابھی کل بچوں کے ساتھ اسلام آباد پہنچی تھی اور آج ایک بجے تن تنہا شمالی علاقوں کی سیاحت کے لیے روانہ ہو رہی تھی۔

تین جولائی کو اسلام آباد پہنچی۔ بھاگ دوڑ کرنے سے پتا چلا کہ گلگت، ہنزہ بائی روڈ جانے کے لیے نیٹکو بس سروس سے سفر کرنا ہو گا۔ پہلی بس صبح چار بجے اور دوسری دن کے ڈیڑھ بجے روانہ ہوتی ہے۔

میرا پہلا پڑاؤ چلاس تھا۔ دوسری بس سے سفر کیا جاتا تو پو پھٹنے پر چلاس پہنچ جاتی۔

گیارہ بجے میں نے بیگ میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ٹوتھ پیسٹ، دوربین اور تولیہ رکھا۔ ڈائری اور پین پنسلوں کا جائزہ لیا۔ ان مقامی لوگوں کے ایڈریس چیک کرنے کے بعد سنبھالے، جن کے گھر مجھے مختلف جگہوں پر ٹھہرنا تھا۔ پیسے دھیلے کو اندر کی جیب میں ٹھونسا۔ اس کی زپ مضبوطی سے بند کی۔ قیمہ بھرے پراٹھوں کا لفافہ بھی رکھ لیا۔

اب ''میجی لن'' اپنے بیڑے کے ساتھ شمالی علاقوں کی سرزمین کے گرد چکر لگانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

صدر روڈ سے سوزوکی میں بیٹھی تو وسوسوں اور اندیشوں کی قطاریں دماغ میں فلم کے ان شیدائیوں کی طرح لگ گئیں جو کسی سپرہٹ فلم کے ٹکٹ کے لیے سینما گھر کی کھڑکی کے سامنے ایک دوسرے کو دھکم پیل دینے میں مصروف ہوتے ہیں۔

پیر ودھائی کے اڈے پر نیٹکو بس سروس سے چلاس کے لیے ٹکٹ کٹوانے لگی تو اونچے کاؤنٹر پر بیٹھے ٹکٹ بابو نے موٹے شیشوں کی عینک سے یوں گھورا جیسے یا تو میں مفرور عورت ہوں یا پھر قتل ڈاکہ ڈال کر پہاڑوں کی گود میں پناہ لینے جا رہی ہوں۔

میں نے پل نہیں لگایا اور جانے کی غرض و غایت پر روشنی ڈال دی۔ چلو اتنا ضرور ہوا کہ اندازِ دید میں تھوڑے سے احترام کے جذبات عود آئے اور یہ بھی محسوس ہوا تھا کہ لہجے میں مٹھاس بھی گھل گئی ہے۔ نرمی اور ملائمت تھی۔ اس نے نرم لہجے میں جب کہا۔

''دراصل یہ راستہ اتنا لمبا اور دشوار گزار ہے کہ مقامی عورتیں بھی بہت کم سفر کرتی ہیں۔ آپ اکیلی ہیں دعا کیجئے کوئی

خاتون آ جائے۔

لمبی چوڑی دعائیں مانگنے کے بعد جب باہر نکلی تو پتا چلا کہ ایک لاہوری جوڑا سیر سپاٹے کے لیے گلگت اور ہنزہ جا رہا ہے۔ میرا دل اس وقت گندوراج کے پھول کی طرح کھل اٹھا۔ لڑکی جس کا نام عروج تھا، مشہور افسانہ نگار ممتاز مفتی کی بھانجی تھی۔ جہاز کا ٹکٹ نہ ملنے کے باعث شاید قدرت نے انہیں میری ہمراہی کے لیے اس طرف دھکیل دیا تھا۔

ڈیڑھ بجے بس چلی۔ ٹیکسلا کی دکانوں میں پتھر کی سجاوٹی اور خانہ داری سے متعلقہ اشیاء پر رنگین نقش و نگاری یوں بہار دکھلا رہی تھی جیسے کسی ریگستان میں کیکٹس کے پودے جلوے بکھیرتے ہیں۔

شاہ راہ ہزارہ پر جگہ جگہ بنے پل گاڑی کے پہیوں کے نیچے سے نکل نکل کر پیچھے بھاگتے رہے۔ جلد ہی ہندکو بولنے والوں کا ہریالی اور شادابی میں ڈوبا ہوا ہری پور کا شہر آیا۔

میرے سامنے والی نشست پر ایک نوجوان نے سگریٹ سلگایا۔ جلتی تیلی کو ہوا میں لہراتے ہوئے بجھایا اور بولا۔

"اس شہر میں کپڑے کے چھوٹے بڑے پچاس کارخانے، پاور ٹرانسفارمر اور بجلی کے سوئچ بنانے کا سب سے بڑا کمپلیکس، ماچس سازی کے چھ کارخانے اور ملک بھر کا کاواساکی موٹر سائیکل کے پرزے جوڑ کراسے بنانے کا کارخانہ ہے۔ ارے ایوب خان اس شہر کو بنا گیا ہے۔"

میں نے ان معلومات پر حیران ہو کر جلدی سے رخ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سڑک کے کنارے غریب اور مفلوک الحال لوگ جگہ جگہ مکئی کے بھٹے کوئلوں پر بھون رہے تھے۔ گندے مندے کپڑوں میں دیہاتی مرد اور عورتیں مریل اور لاغر سے گھوڑوں میں جتے تانگوں میں بیٹھے تھے۔ بے شمار کارخانوں کا مالک ایک صنعتی شہر۔

ہری پور کا پرانا نام گل ڈھیری تھا۔ پشین، بلوچستان سے آنے والے ترین قبیلے کے دور اقتدار میں کشمیر کے گورنر ہری سنگھ نلوہ نے اسے فتح کرنا چاہا پر ہزارہ پلکیا اور تربیلا کے مسلمانوں نے اسے شکست دی لیکن جب رنجیت سنگھ نے گل ڈھیری پر قبضہ جما کر اسے ہری سنگھ کے حوالے کر دیا، تب اس نے اس کا نام ہری پور رکھا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ بھی بنایا۔ قلعے کے چاروں طرف پانی سے لبالب بھری خندق تھی۔ قلعہ میں آمد و رفت کا واحد دروازہ لکڑی اور لوہے کا ایک پل تھا جو رات کے وقت اٹھا لیا جاتا تھا۔ یوں رات کو یہ ایک جزیرے کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ یہ قلعہ اب بھی موجود ہے۔

اس وقت میرا جی چاہا میں چھلانگ مار کر بس کے دروازے سے باہر کود جاؤں اور قلعہ دیکھ آؤں۔ پر افسوس تو یہ تھا کہ نہ تو میرے پاس سلیمانی ٹوپی تھی اور نہ جادو کا سرمہ جسے آنکھوں میں لگا کر اور ٹوپی پہن کر میں موجیں مارتی پھرتی۔

حویلیاں کا خوب صورت شہر گزر گیا۔ حویلیاں سے سولہ کلو میٹر آگے شاہراہ ریشم پر کیپٹن جیمز ایبٹ کے نام پر رکھا گیا ایبٹ آباد شہر سرسبز ٹہنیوں پر کھلے گلاب کی طرح ہنس رہا تھا۔ یہ چوک فوارہ، گلیات، کوہستان، گلگت، کشمیر، کاغان کی وادیوں کا صدر دروازہ ہے۔ ایبٹ آباد رنگ برنگی استعاروں کا شہر ہے۔ شاید اسی لیے اس شہر کے در و دیوار پر نعروں کا انداز بہت تیکھا اور شوخ ہے۔ سطح سمندر سے ۴۲۲۲ فٹ بلند یہاں کا مشہور پہاڑ کوہ سربن ایک ادبی حیثیت بھی رکھتا ہے کہ شاعر مشرق نے بانگ درا میں اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اٹھی پھر آج وہ پورب سے کالی کالی گھٹا
سیاہ پوش ہوا پھر پہاڑ سربن کا

کوہ سربن کے عین نیچے "ارش" کا خوب صورت میدان ہے جس کے سرسبز سینے پر مکان یوں لشکارے مارتے ہیں جیسے سبز قمیض کے دامن پر رنگا رنگ دھاگوں کی کشیدہ کاری۔

ایبٹ آباد سے پندرہ میل کے فاصلے پر مانسہرہ ہے جو مان سنگھ نامی ایک ہندو کے نام پر ہے۔ اس کی تین تحصیلیں مانسہرہ، بٹ گرام، بالاکوٹ اور چوتھی ستو تحصیل اوگی ہے۔ یہاں مہاتما بدھ اور اشوک کے زمانے کی تحریریں کندہ ہیں۔

میں کھڑکی سے گردن باہر نکالے تیزی سے گزرتے خاکی، دوراہا، گاندھیاں کے چھوٹے چھوٹے گاؤں اپنی نظروں میں سمونے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے دوربین بیگ سے نکالی اور آنکھوں سے لگا لی۔ پکھلی کی حسین اور سرسبز وادی دیکھ کر میری آنکھیں پھٹنے کی حد تک پھیل گئی تھیں۔ کوئش کا پُر بہار خطہ یوں لگتا تھا۔ جیسے جنت کے نظارے زمین پر اتر آئے ہوں۔

ڈوڈیال اور شنکیاری دونوں اہمیت کی جگہیں ہیں۔ ڈوڈیال میں مینٹل ہسپتال ہے اور شنکیاری نہ صرف فوجی چھاؤنی ہے بلکہ اہل قلم کا مرکز بھی ہے۔ یہاں سڑک کے کنارے ایک بوڑھا آدمی توے پر روٹیاں پکا رہا تھا جانے اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے یا مسافروں کے لیے۔ اس کی گرم گرم روٹیوں نے مجھے بھوک کا احساس دلایا۔

ڈاڈر کا گاؤں دیکھنے میں چھوٹا۔ میری ایک دوست کی بی بی کی مریض بن کر یہاں آئی تھی اور اس بی بی نے خوب صورت ہسپتال کے ایک کمرے میں دم توڑ دی تھی۔ ڈاڈر کا نام سالوں میرے ذہن پر ٹھکتا رہا۔

چھتریاں، کوٹلی، قاضی آباد، آبل اور بٹل کے گاؤں گزرتے گئے۔ بٹل میں پہاڑوں کی رنگت کیسری تھی۔ بائیں ہاتھ گھاٹیوں میں اندھیرا تھا۔ دائیں ہاتھ کوہستان بٹل کے گھنے جنگلات دیودار، چیڑ اور پلار کے بلند و بالا درختوں کی چوٹیاں جو سورج کی سونا بکھیرتی کرنوں سے لدی پھندی تھیں۔

چھتر پلین کی وادی کافی اونچائی پر ہے۔ برف باری خوب ہوتی ہے۔ بٹ گرام میں دھوپ قدرے پھیکی پڑ گئی تھی۔ اس وادی کے نظارے مجھے کسی عاشق کی طرح آنکھوں سے اشارے کرتے تھے کہ کہاں جاتی ہو؟ اتر آؤ نا یہاں ہمارے پاس۔ بٹ گرام تحصیل کا صدر مقام بھی ہے اسی لیے بیشتر دفاتر یہاں ہیں۔ پشتو اکثریت کی زبان ہے۔ ڈگری کالج بھی بن رہا ہے۔

دریائے سندھ موجیں مارتا رواں دواں تھا۔ سڑک کبھی پیچ کھاتی کسی پہاڑ کے سر پر جا پہنچتی اور کبھی بل کھاتی ہوئی نشیبی وادیوں میں آگے بڑھتی۔ بٹ گرام سے صرف گیارہ میل کے فاصلے پر تھاکوٹ کا عظیم الشان پل جو دنیا میں اپنی نوعیت کا تیسرا پل سمجھا جاتا ہے اب میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

یہاں گاڑی رک گئی تھی۔ میں، عروج اور اس کا میاں زمان اس پل کو دیکھنے کے لیے یوں گاڑی سے نکل کر بھاگے جیسے گاؤں کی دلہن کے ڈولے پر پھینکے جانے والے سکوں کو لوٹنے کے لیے بچے بھاگتے ہیں۔

فنی کاریگری کا منہ بولتا یہ پل دس ماہ کی قلیل مدت میں تیار ہوا تھا۔ دریائے سندھ کی چنگھاڑوں سے دل دہلا جاتا تھا، پر پل کی جوانی اور اٹھان بھی غضب کی اثر انگیز تھی۔

ایک مقامی بوڑھا آدمی میرے پاس آ کر رک گیا۔ میری آنکھوں سے چھلکتی وارفتگی محسوس کرتے ہوئے بولا۔

"وہ بڑا گرم دن تھا جس دن سڑک کا افتتاح ہوا۔ پاکستان کے صدر فوجیوں اور افسروں کے ساتھ یہاں آئے تھے۔ ڈھیر سارے چینی بھی تھے۔ اس دن میلے کا سا سماں تھا۔ میرا پوتا پیدا ہوا تھا اس دن۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ یادداشت کی کڑیوں میں کیسی مماثلت تھی۔

شاہراہ ریشم کی تعمیر ۷ جنوری ۱۹۵۹ء میں شروع ہوئی اور بیس سال میں چوبیس ہزار پاکستانی اور چینی جوانوں کی مشترکہ کاوشوں سے تکمیل کو پہنچی۔ ۱۸ جون ۱۹۷۸ء کو صدر پاکستان جنرل محمد ضیاء الحق نے اس کا افتتاح تھاکوٹ پل پر کیا۔ چین کی نمائندگی نائب وزیراعظم کنگ پیاؤ نے کی۔ اس پل پر سے ۷۰ ٹن وزن گزارا جا سکتا ہے۔

میں ڈائری میں تفصیلات کو نوٹ کرنے میں جتی ہوئی تھی اور ڈرائیور ہارن پر ہارن دیئے جا رہا تھا۔ عروج چیخی۔

"اللہ کی بندی بس کر اب ورنہ چھوڑ جائے گا تمہیں یہاں۔ پھر دیدار کرتی رہنا ساری رات بیٹھ کر اس کا۔" ہم دونوں بھاگیں۔

تھاکوٹ سے ذرا آگے ولائی اور اس سے آگے بشام۔ یہاں پہنچ کر گاڑی بھی رک گئی اور رات بھی اتر آئی۔ یہاں سے سوات نزدیک ہے۔ نوعمر لڑکے سوات جانے والی گاڑیوں پر سوات سوات کا شور مچا رہے تھے۔ سڑک کے کنارے ہوٹل تھے۔ چائے پکتی اور روٹیاں دھڑا دھڑ لگتی تھیں۔ میلے کچیلے کپڑوں میں حسین صورت لڑکے مسافروں کے آگے سالن کی پلیٹیں اور روٹیاں رکھتے تھے۔ ہوٹلوں کے عقب میں دریائے سندھ کی موجوں کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

میں نے قیمہ بھرے پراٹھے نکالے۔ عروج نے ماش کی دال اور گرم گرم تنوری روٹیاں منگوا لیں۔ اللہ جانے ماش کی دال پکانے کے نسخے ان ٹال ہوٹل والوں کے پاس کہاں سے آ گئے ہیں۔ گھر گرہستن عورتیں بھی انگلیاں چاٹتی رہ جاتی ہیں۔

ابھی چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا ہی تھا کہ چلو چلو کا شور مچ گیا۔ کنڈیکٹر نے تین چکر لگائے اور ہارن نے یوں چیخنا چنگھاڑنا شروع کر دیا جیسے خدانخواستہ ایئر ریڈ ہو گیا ہے۔

باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ مجھے حسرت ہوئی کہ اے کاش چاندنی رات ہوتی۔ کہیں کہیں جگنو سے ٹمٹماتے تھے جو یہ بتاتے تھے کہ یہاں وادیاں ہیں اور گھروں میں بتیاں روشن ہیں۔ ابھی صرف ۲۲۰ میل کا سفر طے ہوا تھا۔

شاہراہ ریشم کا وہ حصہ جو بشام سے سازین تک ہے۔ قدرت کے حسین مناظر سے پر ہے۔ بشام سے ہربن تک دریائے سندھ کے دونوں جانب واقع علاقے کوہستانی کہلاتے ہیں۔ ہزاروں سال قبل جب سکندر اعظم نے ٹیکسلا فتح کیا تو یہ علاقہ ٹیکسلا کا ایک حصہ تھا۔ چندر گپت اشوک اور راجہ رسالو نے مدتوں اس علاقہ پر حکومت کی۔

تیمور نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد اس علاقے کو ترکوں کے سپرد کر دیا۔ اسلامی حکومت کی بنیاد تبھی رکھی گئی۔ اس وقت یہ علاقہ ولایت پکھی کہلاتا تھا۔ ترکوں کے زوال کے بعد درانی غالب آ گئے۔ بعد میں نا اتفاقیوں کی وجہ سے ہزارہ پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن کوہستان کا علاقہ ان کے قبضے سے آزاد رہا۔ انگریزی دور میں بھی اس علاقے نے اپنی آزادی برقرار رکھی۔ آزادی پاکستان کے بعد پاکستان میں شامل ہو گیا۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۶ء کو اسے ضلع کا درجہ دیا گیا۔

یہاں کے لوگ دلیر اور جری ہیں۔ دریائے سندھ کے دونوں اطراف کے لوگوں کی اکثریت شین ذات پر مشتمل ہے۔ لیکن تعجب کی بات ہے کہ رسم و رواج عادات و اطوار اور آداب و معاشرت میں یک رنگی کے باوجود زبانیں اس قدر مختلف ہیں کہ ایک دوسرے کی زبان نہ بول سکتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں۔ ان شینوں کا تعلق عرب قریش سے بتایا جاتا ہے جو سقوط سندھ کے بعد ہندوؤں کے ظلم و ستم سے بھاگ کر قبائلی علاقوں میں آئے اور پھر کوہستانی علاقوں میں پھیل گئے۔ پشتو دونوں طرف کے لوگوں کے رابطے کی زبان ہے۔

سندھ کے آر پار رہنے والے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ شادی بیاہ نہیں کرتے۔ مغربی جانب کے لوگ مشرقی جانب کی نسبت زیادہ تعلیم یافتہ اور دینی ہیں۔ دین کے بڑے بڑے جید علماء نے یہاں جنم لیا ہے۔ لوگ خوب صورت اور دراز قد قامت ہیں۔ ذہین اور معاملہ فہم ہیں۔ جلکوٹ کے علاقے میں قتل و غارت گری بہت ہوتی ہے۔ معمولی بات پر قتل کر ڈالتے ہیں۔ قتل کرنے کے بعد مینار جیسے تین منزلہ مکان میں بند ہو جاتے ہیں۔ یہ مکان گھڑی کہلاتا ہے۔ یوں اب دریا کا مشرقی علاقہ ضلع ہزارہ اور مغربی حصہ ضلع سوات کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا ہے۔ قانون کا مکمل نفاذ عمل میں لایا گیا ہے اور علاقے میں قتل و غارت گری کی گرم بازاری بہت دور تک کم ہو گئی ہے۔ بس اب تیز رفتاری سے پٹن کی جانب رواں دواں تھی۔ بشام سے 26 میل آگے پٹن اور تقریباً 94 میل چلاس۔ میرے سفر کی پہلی منزل۔ (باقی آئندہ)

اَلصَّبُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ (بڑا بردبار)

اَلصَّبُوْرُ جَلَّ جَلَالُہٗ اپنے گناہ گار بندوں کو سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں اور بندیوں سے بہت محبت فرماتے ہیں۔ نافرمانی ہو جائے تو وہ فوراً سزا نہیں دیتے بل کہ اپنے بندوں کی توبہ کا انتظار کرتے ہیں۔ جو بھی اس سے معافی مانگے تو معافی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں۔

اَلصَّبُوْرُ کا لفظ صبر سے بنا ہے۔ جب کوئی مصیبت آ جائے تو اس پر صبر کرنا کیوں کہ اس دُنیا میں تکلیف اور آرام، دکھ سکھ، خوشی غم، کام یابی ناکامی آتی رہتی ہے۔

ان چیزوں پر صبر کرنا اسے بہت پسند ہے۔ صبر کرنے والوں کے ساتھ اللہ کی مدد ہوتی ہے۔ کسی تکلیف پر صبر کرنا بغیر حساب کے ثواب دلاتا ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم ہے: ''اگر کسی کو کوئی رنج پہنچا اور اس پر اس نے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لیے صبر کر لیا تو اس صبر پر اسے ثواب تو ملے گا ہی، اللہ تعالیٰ اسے جنت عطا فرمائیں گے۔''

طائف کی وادی اور......

تنزیل کب سے الماری میں کسی کتاب کو تلاش کر رہا تھا۔

''پتا نہیں کہاں ہے؟'' وہ جھنجھلا کر کہہ اُٹھتا۔

''بیٹا! کیا تلاش کر رہے ہو؟'' امی نے پوچھا۔

''امی! محمد بن قاسم کے بارے میں اُستادِ محترم نے ایک مضمون لکھنے کے لیے دیا ہے۔ محمد بن قاسم کی معلومات والی کتاب تلاش کر رہا ہوں۔''

''وہ کتاب سمیرا کے پاس ہے۔'' یہ سنتے ہی وہ آگ بگولہ ہو گیا اور بے تحاشا بہن سے جھگڑنے لگا۔

''جہاں سے کتاب اُٹھاتی ہو استعمال کے بعد وہاں نہیں رکھ سکتی۔''

اس جھگڑے پر سمیرا نے دو دن تک تنزیل سے بات نہ کی تھی۔

''بیٹا! کتنا مضمون باقی ہے؟''

''امی! ابھی آدھا مضمون ہوا ہے۔ امید ہے کہ دو دن میں مکمل ہو جائے گا۔''

''بیٹا! آپ کو معلوم ہے کہ محمد بن قاسم کے آباء و اجداد کہاں کے تھے؟'' اس نے انکار میں سر ہلایا۔

امی سے تنزیل، محمد بن قاسم کے بارے میں معلوماتی بات

بڑے غور سے سننے لگا:

''حضورﷺ لوگوں کو دین کی تبلیغ فرماتے۔ مکہ کے لوگ آپ ﷺ کو بہت تکلیف پہنچاتے، جب تک آپ ﷺ کے چچا جناب ابوطالب زندہ تھے تو وہ آپ ﷺ کی مدد کرتے، مگر ان کے انتقال کے بعد مکہ کے کافر بہت زیادہ تکلیف دینے لگے۔

حضور ﷺ، طائف تشریف لے گئے کہ وہاں ایک قبیلہ ہے جس کا نام ''ثقیف'' تھا۔ یہ بہت بڑا قبیلہ تھا۔ اگر یہ قبیلہ مسلمان ہو جائے تو مسلمانوں کو تکلیفوں سے نجات مل جائے اور دین پھیلنے کی بنیاد پڑ جائے۔

وہاں تین سردار تھے، مگر انہوں نے کوئی بات نہیں سنی اور بہت بُرا سلوک کیا۔ شہر کے لڑکے پیچھے لگا دیے اور آپ ﷺ کو بہت پتھر مارے اور آپ ﷺ کو لہولہان کر دیا۔ آپ ﷺ کو چھ میل تک یہ لڑکے پتھر مارتے رہے اور آپ ﷺ برداشت کرتے رہے۔

حضور ﷺ اسی حالت میں ایک جگہ رُکے۔ جب سب لڑکے واپس چلے گئے تو آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی:

''اے اللہ میں تجھ سے ہی اپنی کم زوری کی فریاد کرتا ہوں۔ تُو ہی ضعیفوں کا رب ہے۔'' بہت دیر تک دعا مانگتے رہے۔ آپ ﷺ نے طائف والوں کے لیے کوئی بددُعا نہیں فرمائی۔ ایک فرشتہ حاضر ہوگیا اور سلام عرض کرنے کے بعد کہا: ''اگر حکم فرمائیں تو دونوں طرف کے پہاڑوں کو ملا دوں جس سے یہ سارے طائف والے کچل جائیں اور سرمے کی طرح پس جائیں۔''

مگر آپ ﷺ نے اس تکلیف پر صبر فرمایا اور اس صبر والے نبی نے جواب دیا کہ: ''اگر یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تو ان کی اولاد میں سے ایسے لوگ ہوں گے جو مسلمان ہوں گے۔''

چناں چہ حضور ﷺ کے صبر کا ہی نتیجہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے محمد بن قاسم کو پیدا فرمایا۔ محمد بن قاسم طائف والوں کی اولاد میں سے ہیں۔ سندھ کو ''باب الاسلام'' اسلام کا دروازہ کہتے ہیں۔

محمد بن قاسم کی وجہ سے آج پاکستان میں اسلام کی بہار ہے۔

محمد بن قاسم کا وجود ہمارے حضور ﷺ کے صبر کا نتیجہ ہے، ورنہ وہ سارے لوگ کچل کر ختم کر دیے جاتے۔

''سمیرا سے جھگڑ کر تم نے بھی بے صبری دکھائی ہے۔ آپ بہن کو پیار سے بھی تو سمجھا سکتے تھے۔ اس طرح پیار سے سمجھانے سے وہ سمجھ جاتی اور آئندہ کتاب پڑھ کر وہیں اپنی جگہ پر رکھتی۔ جاؤ! اب جا کر اس سے معافی مانگو اور اس سے صلح کرو۔''

یہ سب سن کر وہ بے اختیار مسکرا اُٹھا۔

''جی امی! مجھ سے غلطی ہوئی۔'' وہ سمیرا کی طرف معذرت کرنے کے لیے بڑھا مگر سمیرا نے اسے پہلے ہی معاف کر دیا۔

شکر اور صبر

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کے لیے اور کوئی تکلیف آ جانے پر صبر کی یہ دعا مانگیے تا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں شکر کرنے والوں اور صبر کرنے والوں میں سے بنا دے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ شَکُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا.

ترجمہ: اے اللہ! مجھے بہت شکر کرنے والا اور اچھے طریقے سے صبر کرنے والا بنائیے۔

یاد رکھنے کی باتیں

1- اللہ تعالیٰ نہ کرے کوئی تکلیف یا مصیبت آ جائے تو اس تکلیف پر بے صبری نہ دکھائیں بل کہ صبر کریں اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کو سوچیں جو اس نے ہمیں دے رکھی ہیں، تو پھر صبر آ جائے گا۔

2- اللہ تعالیٰ دُنیا کی مصیبتوں اور پریشانیوں کے بدلے آخرت میں بلند درجے عطا فرماتے ہیں۔ اگر کانٹا بھی چُبھ جائے تو اس پر ثواب ملتا ہے۔

3- اپنے سے نیچے والوں کو دیکھیں جن کے پاس وہ نعمتیں نہ ہوں جو ہمارے پاس ہیں، اس طرح اللہ تعالیٰ کا شکر ادا ہوگا۔

اقوالِ زریں

☆ بغیر عمل بلانے والا اس تیر پھینکنے والے کی طرح ہے جس کے پاس کمان نہ ہو۔

☆ فضول خرچی نہ کرنا دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے کئی گنا اچھا ہے۔

☆ دنیا کی محبت اور خدا کی محبت دونوں ایک دل میں نہیں رہ سکتی۔

☆ تین لوگوں پر جنت حرام ہے۔ ۱۔ چغل خور ۲۔ شرابی ۳۔ بدکار

☆ وفاداری پاکیزہ صفت ہے۔

☆ جھوٹ بولنا گفتگو کے لیے آفت ہے۔

☆ بے وقوفی بہت بڑا عیب ہے۔

(حجاب کاظمی، کوٹ مومن)

سونے کا مور

احمد عدنان طارق

ہزاروں سال پہلے ایک موچی کہیں جا رہا تھا کہ مٹی کے اَٹے راستے میں اسے ایک انتہائی چمکتی ہوئی چیز ملی۔ اس نے اسے اُٹھا کر قمیص کے دامن سے صاف کیا تو حیرانی سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہ خالص سونے سے بنا ہوا ایک مور تھا۔ یہ تھا تو چھوٹا سا لیکن بنانے والے کاری گر کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس چھوٹے مور کی آنکھوں میں زمرد جڑے ہوئے تھے اور اس کی پھیلائی ہوئی دُم میں بے شمار ہیرے موتی آویزاں تھے۔ اس کی خوب صورتی پر نگاہ نہیں ٹکتی تھی۔ وہ موچی بہت ہی ایمان دار شخص تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ اتنی قیمتی چیز ہے کہ اسے بادشاہ سلامت کے محل میں لے جا کر ان کی خدمت میں پیش کرنا چاہیے۔ بادشاہ سلامت بھی اس خوب صورت مور کو دیکھ کر یک بارگی مبہوت ہو گئے۔ وہ تعریف کرتے ہوئے مور کو اپنے دونوں ہاتھوں میں الٹ پلٹ کرتے ہوئے بار بار دیکھ رہے تھے۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ یہ ایک انمول چیز ہے جیسے کسی نے کام کرتے ہوئے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہو۔ اس ننھے سے مور میں ہیرے موتی جڑتے ہوئے کسی نے ہفتوں بلکہ مہینوں تک اس پر محنت کی ہے۔ بادشاہ سلامت ہر قیمت پر اس مور کو خریدنا اور اسے خرید کر اپنے ہاتھی دانت سے بنے ہوئے کارنس پر رکھنا چاہتے تھے تاکہ ہر کوئی اسے دیکھ کر اس کی خوب صورتی سے محظوظ ہو سکے۔

بادشاہ سلامت نے پوری ریاست میں ہرکارے بھیج کر منادی کروائی تاکہ اس سونے کا مور کے بنانے والے کی تلاش کی جائے اور وہ بادشاہ سلامت کے سامنے پیش ہو اور بادشاہ سلامت اس سے مور کو خریدیں۔ منادی کروانے کے لیے ہرکارے ملک کے کونے کونے میں بھجوا دیے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ منادی کے ایک ہفتہ بعد دو اشخاص بادشاہ سلامت کے حضور پیش ہو گئے۔ دونوں کا دعویٰ تھا کہ مور اس نے بنایا ہے۔ بادشاہ سلامت نے حیرانی سے انہیں دیکھا، ظاہر ہے ان میں سے ایک جھوٹ بول رہا تھا۔ ابھی وہ انہیں غصے میں گھور ہی رہے تھے کہ دونوں دعوے دار آپس میں لڑ پڑے۔ ان میں سے ایک کا نام شمی اور دوسرے کا نام مٹو تھا۔ دونوں کا کام ایک ہی تھا، یعنی سونے کو ڈھال کر خوب صورت چیزیں بنانا۔ اب دونوں یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ سونے کا مور اس نے بنایا ہے اور راستے میں آتے ہوئے اس سے گم ہو گیا تھا۔ بادشاہ سلامت نے سختی سے دونوں کی طرف دیکھا اور کہا: ’’تم دونوں میں سے ایک بندہ سچ نہیں بول رہا۔ میرے لیے بہت آسان کام ہے کہ میں اپنے ملازم تمہارے ساتھ تمہارے شہروں میں بھجواؤں اور تمہارے دوستوں اور رشتہ داروں سے معلوم کروں

کہ تم میں سے کس نے یہ مور بنایا ہے۔ یہ اتنی عمدہ تخلیق ہے کہ ہر کوئی اس کے متعلق ضرور جانتا ہوگا۔'' ''بادشاہ سلامت!'' شمی نے آگے بڑھ بادشاہ کو سلام کیا اور کہنے لگا: ''مصاحبوں کو میرے ساتھ بھیجنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیوں کہ اس مور کے متعلق کوئی نہیں جانتا۔ میں نے اسے بڑی راز داری سے بنایا تھا کسی نے اس خوب صورت پرندے کو نہیں دیکھا۔ میں نے اسے صرف اپنی جمالیاتی حس کی تسکین کے لیے بنایا تھا اور میں چاہتا تھا کہ راز داری ہی سے اسے آپ کی خدمت میں پیش کروں۔'' بادشاہ سلامت نے شمی کی کہانی سن کر مھو کی طرف توجہ کی اور اسے پوچھنے لگا: ''شمی نے تو اسے راز دارانہ طریقہ سے بنایا تھا۔ تم بتاؤ کیا کہتے ہو؟ کیا تم نے بھی اس کے بنانے کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کیا اور کیا تمہارے شہر میں کوئی شخص اس پرندے کے بارے میں نہیں جانتا۔'' مھو نے بات شروع کی تو وہ خوف سے کانپ رہا تھا۔ ''بادشاہ سلامت! میرے علاوہ واقعی اس دُنیا میں کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا۔ میں نے بھی اسے بڑی راز داری میں بنایا تھا۔ میں دل کی گہرائی سے سچ بول رہا ہوں۔'' بادشاہ سلامت نے طنزاً ایک قہقہہ بلند کیا اور کہنے لگے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ تم دونوں جھوٹ بول رہے ہو تو بتاؤ مھو! اتنی خوب صورت، نازک اور مہارت سے بنی ہوئی چیز کو تم نے راز داری سے کیوں رکھا؟ کیا تمہاری وجہ بھی شمی کی وجہ سے ملتی جلتی ہے۔'' مھو نے کہا: ''بلا شبہ بادشاہ سلامت میری بھی ایک وجہ ہے لیکن یہ ویسی نہیں ہے جیسی شمی نے بیان کی ہے۔ میں نے یہ سونے کا منقش مور اپنی اکلوتی بیٹی کی سال گرہ پر تحفے کے طور پر دینے کے لیے بنایا تھا۔ یہ اس کے لیے ایک چونکا دینے والی چیز ہوتی۔ میں نے اسی لیے کسی کو نہیں بتایا۔ لاتعداد راتیں جاگ جاگ کر میں نے اسے بنایا ہے۔ بادشاہ سلامت! اس میں آویزاں کرنے کے لیے میں نے ایک ایک قیمتی پتھر تلاش کرنے پر مہینوں محنت کی ہے۔''

''تم جھوٹے ہو!'' شمی، مھو کی باتیں سن کر فرط جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور چلایا: ''میں نے اس سونے کے مور کے پر بنانے کے لیے دن رات عرق ریزی کی ہے۔ میں نے سونے کو بار بار ڈھال کر آخر اس پرندے کی یہ خوب صورت چونچ بنائی ہے۔'' ''خاموش ہو جاؤ!'' بادشاہ غصے سے چلایا۔ ''اب میرے لیے یہ ایک ایسا معما ہے جو اس سے پہلے میرے پاس نہیں آیا۔ یہ اتنا خوب صورت پرندہ ہے اور اس پر اتنا خوب صورت کام ہوا ہے کہ میں پہلی نظر میں ہی اس پر ریجھ گیا تھا اور میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس کے اصل مالک سے اسے خرید لوں۔ ایسا لگتا ہے کہ تم دونوں ہی اس کے مالک ہو لیکن یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ یہ البتہ سوچنے والی بات ہے۔'' شمی پھر منمنایا۔ ''یہ میرا ہے بادشاہ سلامت!'' اسی طرح مھو کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور وہ بھی زیرِ لب یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔ پھر شمی نے بادشاہ سلامت کو تجویز پیش کی کہ اگر وہ مور اس کو دے دے تو وہ جو قیمت اسے خریدنے کے لیے سوچ چکا تھا، میں اسے اس سے آدھی قیمت پر بیچ دوں گا اور تمہارا کیا کہنا ہے، اگر مور تمہیں دے دیا جائے؟ مھو کیا تم بھی اسے آدھی قیمت پر بیچنے کے لیے تیار ہو؟'' بادشاہ سلامت نے مھو سے پوچھا تو وہ پھر کانپتے ہوئے بولا: ''نہیں جناب، میں نے اسے اپنی بیٹی کے لیے بنایا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں اسے بیچنے کی بجائے شمی کو دے دوں گا۔'' بادشاہ سلامت

نے دوبارہ دونوں دعوے داروں کو غور سے دیکھا اور یوں مخاطب ہوا: ''تم دونوں سونے کے مور پر دعویٰ کرتے ہو کہ اسے تم نے بنایا ہے اور میرے پاس سچ ثابت کرنے کے لیے کوئی ذریعہ نہیں ہے، لہٰذا میں اس سے بہتر فیصلہ نہیں کر سکتا کہ مور کے دو حصے کر دیئے جائیں اور تم میں سے ایک کو مور کے سر والا حصہ دے دیا جائے اور دوسرے کو کمر والا حصہ۔ اس کے لیے ہم کوئی طریقہ وضع کر لیتے ہیں کہ کسے کون سا حصہ دیا جائے۔'' یہ سن کر شمی خوشی سے چلایا اور کہنے لگا: ''یہ ٹھیک فیصلہ ہے اور اسے قبول ہے۔'' مٹھو کچھ نہیں بولا۔ تب بادشاہ نے اس کی رائے مانگی۔ وہ غم سے نڈھال نظر آ رہا تھا۔ مٹھو آگے بڑھا اور بادشاہ کے قدموں میں گر گیا اور کہنے لگا: ''یہ ظلم نہ کریں بادشاہ سلامت! مور کے دو حصے نہ کیجیے گا۔ یہ بہت خوب صورت ہے، میں نے اس پر بہت محنت کی ہے۔ یہ دو حصوں میں علیحدہ ہونے سے اپنی ساری خوب صورتی کھو بیٹھے گا۔ یہ مور صرف سونے اور جواہرات کا مرکب نہیں ہے بلکہ میری بیٹی کے لیے میرے جذبات کا اظہار ہے۔ میں اسے ضائع ہوتے دیکھنے کی بجائے خواہش کروں گا کہ اسے پورے کا پورا شمی کو دے دیا جائے۔ میں اپنی محنت اپنی آنکھوں کے سامنے ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں چلتا ہوں، آپ اسے شمی کو دے دیں تاکہ وہ آپ کو مور دے کر اس کی قیمت وصول کرے۔'' جب مٹھو دروازے کی طرف بڑھا تو بادشاہ نے اسے واپس بلا لیا۔ بادشاہ سلامت نے پیار سے مٹھو کو کہا: ''پرندہ واقعی تمہارا ہے، میں تمہارے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچنے دوں گا۔ یہ تو صرف امتحان تھا۔ میں مور کے اصل مالک کو ڈھونڈنے کے لیے تم دونوں کو آزما رہا تھا۔

میں جانتا ہوں جس نے اتنی محنت سے یہ شاہ کار بنایا ہے، وہ اسے تباہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ تم اپنی امانت کو واپس لے لو اور اسے اپنی بیٹی کو تحفے میں دے دینا لیکن جب بھی تمہیں وقت ملے اس جیسا دوسرا مور مجھے بنا کر دینا۔ میں تمہیں منہ مانگا معاوضہ ادا کروں گا اور اسے تم سے تب لوں گا جب تم اپنی خوشی سے اسے مجھے دو گے۔'' مٹھو نے ہاتھ بڑھا کر مور بادشاہ سے لے لیا۔ اس نے بادشاہ سلامت کے منہ سے جو سنا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس کے گالوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ ایک لفظ تک ادا کرنے سے قاصر تھا۔ اس نے سونے کا مور بنانے کے لیے اتنی محنت کی تھی۔ اسے مور کھو دینے کا بہت دکھ ہونا تھا۔ اب

وہ یہ تحفہ اپنی چھوٹی بیٹی کو اس کی سال گرہ پر دے سکتا تھا جیسا کہ اس نے سوچ رکھا تھا۔ اب وہ ایک خوش باش اور مطمئن انسان تھا لیکن اب کانپنے کی باری شمی کی تھی۔ پکی ہوئی ناشپاتی کی طرح اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ''اسے زندان میں لے جاؤ۔'' بادشاہ نے حکم دیا۔ ''نہیں نہیں، بادشاہ سلامت! اس پر رحم کریں۔'' مٹھو گڑگڑایا۔ ''میں اسے سزا پاتے نہیں دیکھ سکتا۔'' بادشاہ مسکرا دیا۔ اس نے مٹھو کو کہا کہ تمہارے ہاتھوں میں جتنا ہنر ہے اتنی ہی تمہارے جسم کے اندر خوب صورت روح ہے۔ تم آج سے میرے مصاحب ہو اور میری عدالت میں ہی بیٹھا کرو گے۔ مجھے تم جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا مٹھو کو بادشاہ سلامت کے محل میں مصاحب کی جگہ مل گئی اور اس نے اپنی آئندہ زندگی اپنے عقل مند بادشاہ کے لیے خوب صورت تحائف بناتے ہوئے گزار دی۔ ☆☆☆

بہترین معلومات

محرم الحرام میں پیش آنے والے تاریخ اسلام کے اہم واقعات

☆ 8 نبوی ...... نبی کریم ﷺ اپنے خاندان بنو ہاشم کے ساتھ شعب ابی طالب میں قیام فرما ہوئے۔

☆ 12 نبوی ...... نبی کریم ﷺ نے مکہ سے مدینہ ہجرت فرمائی اور اسی نسبت سے اسلامی تقویم ہجری تقویم کہلاتی ہے۔

☆ 7 ہجری ...... نبی کریم ﷺ نے اسلام کی عالمگیر تبلیغ کا آغاز کیا اور مختلف ممالک کے سلاطین کے نام مکتوبات ارسال فرمائے۔

☆ 7 ہجری ...... غزوۂ خیبر پیش آیا جس میں مسلمانوں نے مدینہ منورہ کے قریب یہودیوں کے قدیم گڑھ کا خاتمہ کر دیا۔

☆ 7 ہجری ...... سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا رسول اکرم ﷺ کے نکاح میں آئیں۔

☆ 7 ہجری ...... مہاجرین حبشہ امن قائم ہونے کے بعد واپس مدینہ منورہ تشریف لے آئے۔

☆ 9 ہجری ...... زکوٰۃ کی تنظیم قائم ہوئی اور اسے مسلمانوں پر نافذ کیا گیا۔

☆ 11 ہجری ...... نبی کریم ﷺ کی خدمت میں نخع کا وفد حاضر ہوا جو آپ کی ظاہری حیاتِ مبارکہ میں آپ سے ملاقات کرنے والا آخری وفد تھا۔

☆ 12 ہجری ...... سیدنا عمر فاروقؓ نے ہجرت مدینہ کی مناسبت سے اسلامی تقویم کو نافذ کیا۔

☆ 21 ہجری ...... سیدنا عمر فاروقؓ کی خلافت میں لشکرِ اسلام نے نہاوند کی بے مثال فتح حاصل کی۔

☆ 24 ہجری ...... سیدنا عمر فاروقؓ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا۔

☆ 24 ہجری ...... سیدنا عثمان غنیؓ خلافت راشدہ کے منصب پر فائز ہوئے۔

☆ 36 ہجری ...... سیدنا علی کرم اللہ وجہہ امیر المومنین منتخب ہوئے۔

☆ 61 ہجری ...... سیدنا امام حسینؓ نے اپنے جاں نثاروں سمیت جام شہادت نوش فرمایا۔

نافرمان بچے اور والدین کی نا سمجھی

نا سمجھ والدین اور گھر کی خشک اور خطیبانہ فضا بھی بچے کو گستاخ بنا دیتی ہے۔ بسا اوقات بچوں کی گستاخی، ان کی کم فہمی اور سرمایہ الفاظ کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مثلاً آپ پیار سے ننھے کو اُلو کہیں اور دوسرے دن وہ سب کے سامنے آپ کو بھی اُلو کہنے لگے تو اس کی معصوم گستاخی پر خفا نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے ابھی الفاظ کا صحیح استعمال نہیں سیکھا۔ اکثر والدین شکایت کرتے ہیں کہ ان کے بچے گالیاں بکتے رہتے ہیں۔ بڑوں کا ادب نہیں کرتے اور بہت نافرمان ہوتے جا رہے ہیں۔ بچوں کو گالیاں بکنے سے بچانے کے لیے اسے محلے کے گندے بچوں کی صحبت سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔ بچوں سے احترام کی توقع رکھنے سے پہلے بزرگوں کو خود بھی اپنے قول و فعل میں احتیاط برتنا چاہیے۔

بعض بزرگ بچوں کو ایسے ایسے مشکل احکام دینا شروع کر دیتے ہیں کہ بچے حیل و حجت، تساہل، انکار، ضد وغیرہ کے مختلف مدارج سے گزرتے ہوئے صاف انکار کے پورے گستاخ رویہ کو مستقل طور پر اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بچوں کو اپنی بساط سے زیادہ مشکل کاموں کے لیے کہنا سخت غلطی ہے۔ بڑوں کا احترام کرنے اور ہر ایک سے اچھی طرح پیش آنے کی تعلیم کے لیے بھی چھڑی کا استعمال بے حد خطرناک ہے۔ فرماں برداری اور اطاعت کی تربیت کے لیے مؤدب اور نیک بچوں کی دل چسپ کہانیاں بہت مفید ثابت ہوتی ہے۔ گھر میں بچوں کو شروع ہی سے مناسب اختیار اور آزادی دینی چاہیے اور ساتھ ہی اس آزادی کو صحیح طور پر استعمال کرنے کے لیے کچھ رہنمائی بھی ہونی چاہیے۔ ہر وقت گھر کے اندر مقید رہنے سے اور بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی خشک نصیحتیں اور ہدایتیں سنتے رہنے سے بچہ اُکتا جاتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ وہ اس بے کیف اور خطیبانہ ماحول سے بغاوت پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ بچوں کو سمجھانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے موقع و محل دیکھ کر بات کیجئے اور بچے کے موڈ کو مدنظر رکھیں۔ غیر موزوں موقع پر نصیحت الٹی غیر مفید ثابت ہوتی ہے اور بچہ مزید ضد میں آ کر الٹی سیدھی حرکتیں کرتا رہتا ہے۔ غصہ کی حالت میں وہ صرف آپ کا پیار اور توجہ چاہتا ہے۔ لہٰذا اپنے ساتھ لگالیں اور محبت کا اظہار کریں اور جب دیکھیں کہ بچے کا غصہ رفو ہو گیا ہے تو اسے اچھے اور نرم الفاظ سے سمجھا دیں۔ اگر آپ آغاز ہی سے اس ذمہ داری کا کام شروع نہ کریں گے تو بعد میں بہت مشکل ہو گی۔ بچے کی عادات پختہ ہو چکی ہوتی ہیں اور وہ انہیں بڑی مشکل سے بعد چھوڑتا ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی موقع پائیں بچے کو سمجھائیں۔ موقع محل پر نصیحت بہت اثر انداز کرتی ہے۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/نومبر 2014ء ہے۔

نام: ____________

شہر: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10/نومبر 2014ء ہے۔

نام: ____________

مقام: ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

ہونہار مصور

نومبر کا موضوع "علامہ اقبال" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08/نومبر 2014ء ہے۔

نام ____________ عمر ____________

مکمل پتا: ____________

موبائل نمبر: ____________

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ____________ شہر ____________

مقاصد ____________

موبائل نمبر: ____________

ٹیچر (لائبہ سے): ''اے بی سی سناؤ؟''
لائبہ: ''اے بی سی۔''
ٹیچر: ''اور سناؤ۔''
لائبہ: ''اللہ کا شکر ہے، آپ سنائیں؟''
(رشدہ عدنان، کراچی)

☆☆

دو پاگل آپس میں باتیں کر رہے تھے۔
پہلا: ''تم انگلینڈ سے کب آئے ہو؟''
دوسرا: ''پندرہ تاریخ کو۔''
پہلا (حیرانی سے): ''لیکن آج تو تیرہ تاریخ ہے۔''
دوسرا: ''مجھے ذرا جلدی تھی۔ اس لیے دو دن پہلے آ گیا ہوں۔''
(حرا ظفر، گوجرانوالہ)

پہلا دوست (دوسرے سے): ''میرے نئے فلیٹ کا نمبر 10 ہے۔ جب آؤ تو اپنی کہنی دروازے پر لگی گھنٹی پر رکھ کر زور سے دبانا۔''
دوسرا دوست: ''کہنی کیوں، انگلی کیوں نہیں؟''
پہلا دوست: ''میرے کہنے کا مطلب ہے کہ تم میرے گھر خالی ہاتھ تو نہیں آؤ گے۔''
(ثریا عبدالستار انصاری، چوہنگ لاہور)

☆☆

ایک بچہ رو رہا تھا۔ باپ نے رونے کا سبب پوچھا تو بولا: ''ایک روپیہ دے دیں تو بتاؤں گا۔''
باپ نے جلدی سے ایک روپیہ دیا اور کہا: ''کیوں رو رہے تھے؟''
''اس روپے کے لیے ہی رو رہا تھا۔'' بچے نے چپ ہوتے ہوئے جواب دیا۔
(طوبیٰ خان، ٹی آئی پی کالونی)

☆☆

باپ (بیٹے سے): ''افضل تم رات کو کس وقت سوئے تھے؟''
افضل: ''میں رات کو دو بجے تک ہوم ورک کرتا رہا تھا۔''
باپ: ''مگر رات گیارہ بجے تو بجلی چلی گئی تھی۔''
افضل (گھبراتے ہوئے): ''میں پڑھنے میں اتنا مگن تھا کہ بجلی آنے اور جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔'' ☆☆

ایک گدھا کسی گھر کی دیوار سے کان لگائے کھڑا تھا کہ ایک بکری کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے گدھے سے پوچھا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ گدھے نے جواب دیا کہ اندر دو آدمی لڑ رہے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کو گدھے کا بچہ کہہ رہے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان دونوں میں سے میرا بچہ کون سا ہے۔
(سید نقیب الفضل ہاشمی، راولپنڈی)

ڈاکٹر (مریض سے): ''تم نے پچھلے ہفتے میری فیس کا جو چیک دیا تھا، وہ کیش نہیں ہوا اور واپس آ گیا ہے۔''
مریض: ''اس کا مطلب ہے میرا تمہارا حساب برابر ہو گیا کیوں کہ میرے سر کا درد بھی سر میں واپس آ گیا ہے۔''
(عثمان اکرم، ملتان)

☆☆

ماں (بیٹے سے): ''منے! آپ باورچی خانے میں نہ جایا کریں وہاں جن رہتے ہیں۔''
منے میاں (معصومیت سے): ''تو امی مٹھائی جن ہی کھاتے ہوں گے، آپ مجھے کیوں ڈانٹتی رہتی ہیں۔''

☆☆

شاگرد: ''جناب آپ نے مجھے حساب میں صفر دیا ہے، میں سخت پریشان ہوں۔''
استاد: ''اور میں اس لیے پریشان ہوں کہ اس کے نیچے کوئی اور ہندسہ نہیں جو میں آپ کو دوں۔''
(عتیقہ رحیم، جوہر آباد)

☆☆

استاد (شاگرد سے): ''تم روزانہ دیر سے کیوں آتے ہو؟ الارم والی گھڑی رکھ کر سویا کرو۔''
شاگرد نے جواب دیا: ''جی رکھ کر سوتا ہوں لیکن وہ اس وقت بجتی ہے جب میں سو رہا ہوتا ہوں۔''

☆☆

لڑکا (دکان دار سے): ''کیا آپ کے پاس صابن ہے؟''
دکان دار: ''جی ہاں۔''
لڑکا: ''تو برائے مہربانی دکان میں نہا کر آیا کریں۔'' (حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

میری بیاض سے

اس قدر ظرف تو رکھتے ہیں زمانے والے
زندگی چھین کے جینے کی دعا دیتے ہیں

(صفا رشید، کراچی)

جہاں میں ایسے بھی ناداں کسی نے دیکھے ہیں
چراغ ہاتھ میں ہے اور گفتگو ہوا سے ہے

☆

اتنے سراب دیکھے ہیں آنکھوں نے عمر بھر
دریا بھی اب نگاہوں میں دریا نہیں رہا

(صوفیہ عبداللہ، پشاور)

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہ مسلماں کو تلوار کر دے

☆

بنائے اپنی حکمت سے زمین و آسماں تو نے
دکھائے اپنی قدرت کے ہمیں کیا کیا نشاں تو نے

(محمد زبیر، جوہر آباد)

منزلیں انسان کے حوصلے کو آزماتی ہیں
سپنوں کے پردے آنکھوں سے ہٹاتی ہیں
کسی بھی بات سے ہمت نہ ہارنا
تکلیفیں ہی انسان کو جینا سکھاتی ہیں

(آمنہ سلام، اسلام آباد)

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

(حرا سعید شاہ، جوہر آباد)

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہو گا

(ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ)

سجدوں کے عوض فردوس ملے یہ بات مجھے منظور نہیں
بے لوث عبادت کرتا ہوں بندہ ہوں تیرا مزدور نہیں

(زائش خورشید، ایبٹ آباد)

زندگی ہے یا کوئی طوفان
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(نوید اشرف، حویلی لکھا)

دیار عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو
سکوت لالہ و گل سے کلام پیدا کر

(علینہ احمد، راول پنڈی)

اور کیا چاہیے سجدوں کو قرینے کے لیے
سر ہے کعبے کے لیے دل ہے مدینے کے لیے

(محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان)

کبھی اے حقیقت منتظر! نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں

(کشف طاہر، لاہور)

کس سے رکھیے داغ چشم دوستی
اٹھ گئی یاروں سے یاری اٹھ گئی

(نمرہ عبدالخالق، لاہور کینٹ)

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

(تحریم عثمان، گوجرانوالہ)

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

☆

جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا
ترا دل تو ہے صنم آشنا، تجھے کیا ملے گا نماز میں

(محمد احمد خان، بہاول پور)

پہاڑ اور گلہری

محمد یونس حسرت
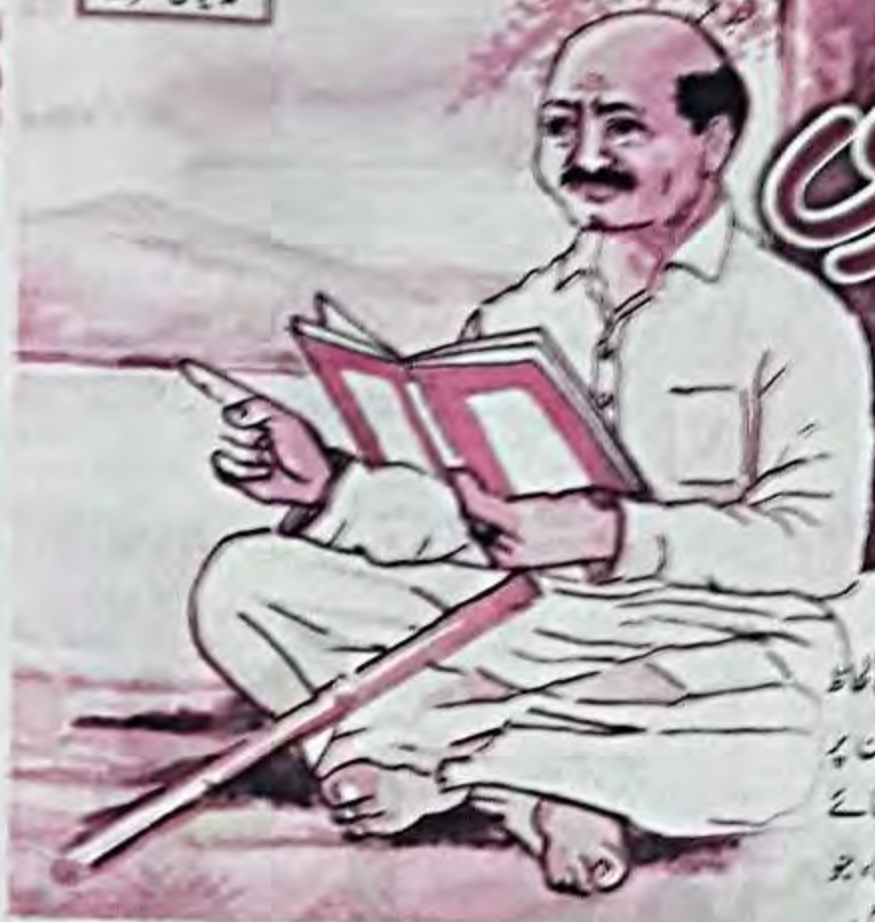
ہمارے ماسٹر صاحب کا پورا نام درویش علی بہادر تھا۔ اس لحاظ سے تو وہ واقعی درویش تھے کہ ان کا سر ہمیشہ منڈا ہوتا تھا مگر ان پر جلالی رنگ کچھ اتنا چھایا ہوا تھا کہ ان کی درویشی محبت کی بجائے خوف کی علامت بن گئی تھی۔ مزید ستم ان کے تخلص نے ڈھایا تھا، جو تھا تو بہار مگر پرائمری اسکول کے بچوں اور گاؤں کے ان پڑھ لوگوں کی زبان پر چڑھ کر پہلے بھار (بوجھ) اور پھر پہاڑ ہو گیا تھا۔ اونچا لمبا قد، دوہرا جسم، سنگِ مرمر کی طرح چمکتا ہوا بڑا سا سر، ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا۔ اس حلیے میں وہ سچ مچ ایک پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔

وہ ہمارے چھوٹے سے گاؤں کے چھوٹے سے پرائمری اسکول کی پانچویں جماعت کے انچارج تھے اور ان کے رعب داب اور دبدبے کا یہ عالم تھا کہ چوتھی جماعت کے بچے پانچویں جماعت میں جانے پر خوش ہونے کی بجائے اس خیال سے کانپ جاتے تھے کہ اب انہیں اس استاد کا سامنا کرنا پڑے گا جو سختی میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اور تو اور گاؤں کی عورتیں بھی اپنے روتے ہوئے بچوں کو ان کا نام لے کر چپ کرایا کرتی تھیں اور انہوں نے ماسٹر صاحب کو اور زیادہ ڈراونا بنانے کے لیے پہاڑ کے ساتھ شاہ کا لفظ بھی لگا لیا تھا۔ جوں ہی بچوں سے کہتیں: "چپ ہو جاؤ نہیں تو پہاڑ شاہ اٹھا کر لے جائے گا۔" تو روتے بلکتے بچے ایک دم سہم کر چپ ہو جاتے۔

ان کی کلاس میں بلا کی خاموشی تھی، ایسی خاموشی جیسے ان کے سامنے جیتے جاگتے لڑکے نہیں، مٹی کے بت دھرے ہوں۔ ایک بار گاؤں کے چودھری کا لڑکا بے خیالی میں کلاس روم میں سیٹی بجانے کی حماقت کر بیٹھا تھا تو انہوں نے اسے یوں روئی کی طرح دھن کر رکھ دیا تھا کہ چودھری اور چودھرائن مہینا بھر اس بے چارے کی ٹکور کرتے رہے تھے لیکن انہوں نے ماسٹر صاحب سے شکایت نہیں کی تھی۔ اصل میں بات یہ تھی کہ سختی کے باوجود وہ ایک لائق استاد تھے اور ارد گرد کے دیہات میں یہ بات مشہور تھی کہ جو لڑکا کسی کے قابو میں نہ آتا ہو، اس کو ماسٹر پہاڑ شاہ کے حوالے کر دیا جائے۔ وہ چند دنوں ہی میں اس کو "بندے کا پتر" بنا دیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ چھوٹا بڑا ہر شخص ان کا ادب کرتا تھا۔ ہاں، یہ بات ضرور ہے کہ اس ادب میں خوف بھی شامل تھا اور اسی لیے ان کے سامنے ہماری ہی نہیں، دوسروں کی زبان بھی یا تو کھلتی ہی نہیں تھی اور کھلتی بھی تو بہت کم۔

شاید یہی وجہ تھی کہ اس دن ہم گلہری کے بارے میں زبان کھولنے کی جرأت نہ کر سکے۔ اس روز بلا کی گرمی پڑ رہی تھی اور نہ صرف ہم بلکہ خود ماسٹر صاحب پسینے میں نہائے ہوئے تھے۔ شہروں کے اسکولوں میں تو پنکھے لگے ہوتے ہیں مگر ہمارا اسکول ایک چھوٹے سے گاؤں کا اسکول تھا جسے شہری لوگ حقارت سے کھوتی اسکول یا تپڑ اسکول کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

ماسٹر صاحب نے اُردو کا سبق پڑھانے کے لیے کتاب کھولی ہی تھی کہ پسینے کے چند قطرے ان کے سر اور چہرے سے ہوتے ہوئے کتاب پر آ گرے اور وہ ہمیں اُٹھنے کا اشارہ کر کے باہر کی طرف بڑھے۔

باہر گراؤنڈ میں ایک چھوٹا سا گھاس کا پلاٹ تھا جس کے ایک کونے میں شیشم کا ایک درخت تھا۔ ماسٹر صاحب اسی پلاٹ کی طرف

جا رہے تھے۔ میں کلاس روم سے ماسٹر صاحب کی کرسی اُٹھانے لگا تو انہوں نے اشارے سے روک دیا۔ چناں چہ ماسٹر صاحب شیشم کے درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے اور ہم پانچویں جماعت کے 30 لڑکے ان کے سامنے نصف دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔

ماسٹر صاحب نے اُردو کی کتاب کھولی، کھنکار کر گلا صاف کیا اور پھر کہنے لگے:

''بچو، آج ہم علامہ اقبالؒ کی نظم ''پہاڑ اور گلہری'' پڑھیں گے۔ علامہ اقبالؒ ہمارے قومی شاعر ہیں اور انہوں نے بچوں کے لیے کئی پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں......''

ابھی وہ یہاں تک ہی کہہ پائے تھے کہ ان کے گھر سے ان کا دوپہر کا کھانا آ گیا۔ یہ کھانا معمول کے مطابق خاکی رنگ کے لفافے میں تھا۔ ماسٹر صاحب خالی دستر خوان یا خالی برتن واپس لے جانا ایک بوجھ سمجھتے تھے۔ چناں چہ ان کا کھانا لفافے میں آتا تھا جسے وہ کھانا کھا کر پھینک دیتے تھے۔ چپڑاسی کو دیکھ کر ماسٹر صاحب نے ہاتھ سے زمین کی طرف اشارہ کیا اور وہ کھانے کا لفافہ قریب رکھ کر واپس چلا گیا۔ ماسٹر صاحب کہنے لگے۔

''تو بچو، میں یہ کہہ رہا تھا کہ علامہ اقبالؒ نے بچوں کے لیے کئی سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے اکثر نظمیں انگریزی شاعروں کی نظموں سے ماخوذ ہیں۔ چناں چہ یہ نظم ''پہاڑ اور گلہری'' بھی امریکا کے مشہور ادیب فلسفی شاعر آر۔ ڈبلیو۔ ایمرسن کی نظم سے اخذ کی گئی ہے۔ ایمرسن نے اس نظم میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دُنیا میں کوئی چیز بھی نکمی اور بے کار پیدا نہیں کی۔ اس نے یہ بات پہاڑ اور گلہری کی بات چیت کے ذریعے بڑی خوب صورتی سے واضح کی ہے۔ دیکھیے علامہ کتنے پیارے انداز میں ان دونوں کی گفت گو کو بیان کرتے ہیں۔

''کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے اس پر غرور، کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور، کیا کہنا''

ابھی وہ اس دوسرے شعر تک ہی پہنچے تھے کہ ایک موٹی تازی گلہری شیشم کے درخت سے اُتری اور سیدھی کھانے کے اس لفافے کی طرف بڑھی جو ماسٹر صاحب کے قریب پڑا تھا۔ لفافے کے پاس پہنچ کر وہ ذرا کی ذرا رُکی، چوروں کی طرح آہستہ سے اگلے پنجے اُٹھائے اور پھر تیزی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے ان لڑکوں کو دیکھا جو اس وقت جیتے جاگتے لڑکوں کی بجائے لکڑی کے بُت نظر آتے تھے۔ جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ ہماری طرف سے اسے کوئی خطرہ نہیں تو وہ لفافے پر جھپٹی اور اپنے تیز نوکیلے دانتوں سے اسے پھاڑ ڈالا۔

لفافے کا کاغذ پھٹنے سے جو آواز پیدا ہوئی وہ اگرچہ ہم نے سنی لیکن ہمیں کوئی حرکت کرنے یا بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ ماسٹر صاحب نظم پڑھنے میں کچھ اس طرح مگن تھے کہ انہیں اس کا پتا ہی نہ چلا۔ لفافے کے اندر اس روز اندرسے یا اس سے ملتی جلتی کچھ ٹکیاں تھیں۔ گلہری نے بڑے آرام سے ایک ٹکیا اٹھائی اور ہمارے دیکھتے دیکھتے اسے ہڑپ کر گئی۔ پھر وہ لفافے کے اندر گھس گئی۔ اب ہمیں صرف اس کی موٹی سی دم نظر آ رہی تھی۔ ذرا دیر بعد وہ لفافے سے باہر نکلی تو ایک اور ٹکیا اس کے پنجوں میں دبی ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر اپنے اردگرد ڈالی اور پھر تیزی سے درخت پر چڑھ گئی۔

ماسٹر صاحب نظم کے آخری شعر پڑھ رہے تھے جن میں گلہری پہاڑ سے کہہ رہی تھی:

''جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو
نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں''

یہ شعر پڑھ کر انہوں نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں اور ایک

نظر ہم پر ڈالی۔ ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے خوف سے ہماری جان نکلنے کو ہے۔ ہم ڈر رہے تھے کہ کہیں وہ سبق کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھ لیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا اور جو شعر پڑھے تھے، وہ ہمارے سروں پر سے گزر گئے تھے کیوں کہ ہماری نگاہوں کا مرکز وہ گلہری بنی رہی تھی جس نے ابھی ابھی ماسٹر پہاڑ شاہ کا کھانا کھایا تھا لیکن شکر ہے انہوں نے ہم سے کوئی سوال نہ پوچھا۔

پانچ منٹ نہ گزرنے پائے تھے کہ حرص کی ماری گلہری پھر درخت سے اُتری۔ اس دفعہ اس نے ہماری طرف نظر اُٹھا کر دیکھنے کا توقف بھی نہ کیا۔ سیدھی کھانے کے لفافے کی طرف جھپٹی۔ وہ پوری کی پوری لفافے کے اندر تھی۔ صرف اس کی دم نظر آ رہی تھی۔ کاغذ کے پھٹنے کی آواز اس دفعہ ہم نے واضح طور پر سنی۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم نے اس لفافے کو گھاس پر دو تین قلابازیاں کھاتے بھی دیکھا۔

ہمارا جی چاہ رہا تھا کہ خوب زور زور سے قہقہے لگائیں، ماسٹر صاحب کے خوف نے ہمیں پتھر بنا دیا تھا۔ ہمیں توقع تھی کہ کسی بھی لمحے ماسٹر صاحب کو گلہری کی کارستانی کا پتا چل جائے گا اور وہ اسے دم سے پکڑ کر روئی کی طرح دھن ڈالیں گے۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی۔ ماسٹر صاحب کی نظریں بدستور کتاب پر جمی ہوئی تھی۔

کسی کو شاید اس کا یقین نہ آئے لیکن واقعہ یہی ہے کہ اس گلہری نے ہم 30 لڑکوں کے سامنے لفافہ چاک کیا اور اس میں سے ایک ٹکیا نکال کر آدھی اپنے پیٹ میں اُتار لی اور بقیہ آدھی منہ میں دبا کر پھر درخت پر چڑھ گئی۔

ایک منٹ نہ گزرنے پایا تھا کہ لالچ کی ماری گلہری بچے کھچے مال پر تیسرا اور آخری ہلا بولنے کے لیے پھر درخت سے اُتری لیکن ابھی وہ درخت کی جڑوں تک نہ پہنچنے پائی تھی کہ ماسٹر صاحب کے ہونٹ بند ہوئے۔ انہوں نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا اور پھر کتاب ایک جھٹکے کے ساتھ بند کر دی۔ اس کے ساتھ ہی ان کا ہاتھ کھانے کے لفافے کی طرف بڑھا۔ یہ دیکھ کر ہمارے دل اُچھل کر حلق میں آ گئے۔ نیچے کا سانس نیچے اور اوپر کا اوپر رہ گیا۔ ہم اپنی جگہ جم گئے۔ گلہری بھی جم گئی۔ ماسٹر صاحب نے حیرت سے پھٹے ہوئے لفافے کی طرف دیکھا اور پھر اسے ہلاتے ہوئے چیخ کر بولے۔

"یہ کس کی حرکت ہے؟"

گلہری تو موقع پا کر درخت پر چڑھ گئی اور ہم بدحواس ہو کر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کے منہ سے ایک لفظ تک نہیں نکل رہا تھا۔

"اچھا!" ماسٹر پہاڑ شاہ بولے۔ "کان کھول کر سن لو۔ جب تک میرا کھانا مجھے واپس نہیں ملتا، جب تک تم یہاں سے بالکل نہیں ہلو گے، چاہے یہاں بیٹھے بیٹھے بھوک سے مر ہی کیوں نہ جاؤ۔"

ماسٹر صاحب کی یہ دھمکی سن کر ایک لڑکے نے رونا شروع کر دیا۔ اس کے رونے سے لڑکوں کی زبانوں پر لگے ہوئے تالے کھل گئے اور انہوں نے حوصلہ کر کے ماسٹر صاحب کو سارا واقعہ سنا دیا مگر اندر سے ڈر رہے تھے کہ دیکھیں اب وہ ہمارے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ ان سے کسی نرمی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کیوں کہ اب تک انہوں نے کسی بھی معاملے میں نرم دل ہونے کا ہلکا سا ثبوت بھی نہیں دیا تھا اور پھر یہاں تو بات ہی کچھ اور تھی۔ عین ہماری نظروں کے سامنے ایک گلہری ان کا کھانا ہڑپ کر گئی تھی اور ہم نے انھیں بتایا تک نہ تھا۔ اس قصور پر وہ جتنی بھی سزا دیتے، کم تھی۔

ہم ان خوف بھرے خیالوں میں کھوئے ہوئے تھے کہ ماسٹر صاحب کی آواز گونجی اور ہم اس آواز کے لہجے پر چونک اُٹھے۔ ان کے لہجے میں نہ گرج تھی، نہ کڑک، نہ غراہٹ تھی اور نہ غصہ۔ ایک لمحے کے لیے ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہم ماسٹر پہاڑ شاہ کی بجائے کسی اور کی آواز سن رہے ہیں لیکن یہ صرف ہمارا گمان تھا۔ یہ ماسٹر صاحب ہی بول رہے تھے اور سختی بھرے لہجے کی بجائے ملائمت بھرے انداز میں کہہ رہے تھے۔

"بچو، تم نے علامہ اقبال کی نظم پہاڑ اور گلہری پڑھی اور پھر اپنی آنکھوں سے پہاڑ اور گلہری کا مقابلہ بھی دیکھ لیا۔ اس سے یہ بات تمہارے ذہن میں بیٹھ جانی چاہیے کہ دُنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی حقیر نہیں ہے۔ گلہری چھوٹی ہونے کے باوجود وہ کام کر سکتی ہے جو ایک پہاڑ بڑا ہونے کے باوجود نہیں کر سکتا۔ اس کے ساتھ ہی تمہیں یہ بات بھی اپنے پلّے باندھ لینی چاہیے کہ خوف اور ادب کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ آج تو تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے میرا کھانا ضائع ہوا ہے لیکن کل کلاں کو اس قسم کی بے وقوفی سے کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ جاؤ، آئندہ ایسی حماقت نہ کرنا۔"

ہم ماسٹر صاحب کے یہ الفاظ سن کر بے وقوفوں کی طرح ان کا منہ دیکھنے لگے اور پھر بستے سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اس واقعے کو ایک عرصہ بیت گیا ہے لیکن ہم آج بھی جب اس کا تصور کرتے ہیں تو قدرت کے اس احسان کا شکر ادا کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس نے ہمیں زندگی کا ایک اہم سبق سکھانے کے لیے علامہ اقبال کی نظم "پہاڑ اور گلہری" کی جیتی جاگتی تصویر ہماری نگاہوں کے سامنے پیش کر دی تھی۔ ☆☆☆

شہیدِ کربلا...... سیّدنا حسینؓ ابن علیؓ اور پیغامِ کربلا

سیدنا حضرت حسینؓ بن علیؓ کی ولادتِ باسعادت 5 شعبان سن 4 ہجری میں ہوئی۔ رسول اللہؐ نے اپنے دستِ مبارک سے آپؓ کو شہد چٹایا۔ آپؓ کے دہنِ مبارک کو اپنی بابرکت زبان سے تر کیا۔ حسین نام رکھا۔

دنیا کی تاریخ کا ہر ورق انسانوں کے لیے عبرت انگیز ہے۔ خصوصاً تاریخ کے اہم واقعات انسانوں کے لیے ہر شعبۂ زندگی میں اہم نتائج سامنے لاتے ہیں جو کسی دوسری تعلیم و تلقین سے حاصل نہیں ہوتے۔ حضرت حسینؓ کی شہادت کا واقعہ اسلامی تاریخ کا اہم واقعہ ہے بلکہ پوری دنیا کی تاریخ میں اسے خاص امتیاز حاصل ہے۔ کربلا اور حضرت امام حسینؓ کا جب بھی ذکر ہمارے ذہنوں اور لبوں پر آتا ہے تو آپؓ کے مقدس جان نثاروں کی جرأت و ہمتوں اور شہادتوں کا تذکرہ ہمراہ لاتا ہے۔

سیدنا حضرت حسینؓ کا وہ تاریخی خطبہ جو انہوں نے مقام بیضہ میں دیا، تاقیامت ہماری راہ نمائی کرتا رہے گا اور حق پرستی کی شمع روشن رکھنے کا درس دیتا رہے گا۔ آپؓ نے حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد پُرجوش انداز میں فرمایا: ''لوگو! رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جس نے ظالم، محرماتِ الٰہی کو حلال کرنے والے، خدا کے عہد کو توڑنے والے، خدا اور رسول اللہؐ کے مخالف اور خدا کے بندوں پر گناہ اور زیادتی کے ساتھ حکومت کرنے والے حکم ران کو دیکھا اور قولاً وعملاً اسے اس پر غیرت نہ آئی تو خدا کو حق ہے کہ اس حکم ران کو جہنم میں ڈال دے۔ لوگو! خبردار، ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت اختیار کی اور خدا کی اطاعت چھوڑ دی ہے۔ ملک میں فساد پھیلایا ہے۔ حدودِ الٰہی کو معطل کر دیا ہے، مالِ غنیمت میں سے اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں، خدا کی حرام چیزوں کو حلال کر دیا ہے۔ اس لیے مجھے غیرت آنے کا حق زیادہ ہے۔

یہ الفاظ اس ہستی کے ہیں، جن کے بارے میں ہادیٔ برحق حضرت محمدؐ نے ارشاد فرمایا: ''حسینؓ مجھ سے ہے اور میں حسینؓ سے ہوں۔''

شہادت کا رتبہ بھی انہی لوگوں کو ملتا ہے، جو اللہ کے محبوب بندے ہوں، جیسا کہ فرمایا گیا: ''شہداء اللہ کے دوست اور انبیاءؑ کے ساتھی ہیں۔ ہماری یہ ذمہ داری ہے کہ ہم شہدائے کربلاؓ اور جگر گوشۂ رسولؐ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے حق و صداقت کا علم بلند کریں۔ باطل قوتوں کے سامنے نہ جھکیں، ہم دینِ مصطفیٰؐ کے امین ہوں، شہادت کی آرزو ہمارے دل میں ہو تو اللہ کی رحمت ہماری طرف متوجہ ہو گی۔ ہمارے سامنے خالق کی بڑائی ہو گی اور ہم مخلوق سے ڈرنے اور ان کے سامنے جھکنے کے بجائے خدائے واحد کے سامنے جھکیں گے اور ہمارے قلب و زبان پر حق و صداقت کی صدا ہو گی۔ یہی اسوۂ شبیریؓ اور یہی پیغامِ کربلا ہے۔

☆☆☆

کھیل دس منٹ کا

ڈ	ح	ط	ش	غ	ب	ر	م	ک	ث
ف	ء	س	گ	پ	ن	ص	ج	ہ	ل
ر	ض	ت	ش	ا	م	ت	ر	ٹ	د
ا	چ	ن	ا	ر	ی	ا	م	چ	ن
ن	ی	ل	ٹ	ا	ش	ر	ن	ق	ا
س	م	ز	پ	ص	ے	و	ی	ذ	ن
چ	ق	س	ف	ڑ	ج	س	خ	ی	و
ن	ا	ت	س	ک	ا	پ	ء	ک	ی
ب	ظ	ا	د	ض	ن	ا	ع	ر	و
ف	ٹ	ہ	ا	س	پ	ی	ن	ت	ج

آپ نے حروف ملا کر دس مختلف ملکوں کے نام تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان ناموں کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن ناموں کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

شام، یونان، اٹلی، اسپین، فرانس، جرمنی، پاکستان، روس، ایران، ترکی

میری زندگی کے مقاصد
تحریم عاطف، لاہور
میں پائلٹ بن کر ملک کا نام روشن کروں گی۔
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کرنا چاہتی ہوں۔
نور الہدیٰ، رحیم یار خان
میں چائلڈ اسپیشلسٹ بن کر ملک کا نام روشن کروں گی۔
میں ہارٹ سرجن بن کر غریبوں کا مفت علاج کروں گا۔
محمد اذان، لاہور
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا۔
داؤد اقبال، کراچی
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
میں سول انجینئر بن کر ملک کی سرزمین کو خوب صورت سے خوب صورت تر بناؤں گا۔
محمد بلال، لاہور
میں فوج میں شامل ہو کر پائلٹ بنوں گا اور وطن کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔
رشدہ عدنان، کراچی
میں پروفیسر بن کر جونیئر ڈاکٹروں کی راہ نمائی کروں گی اور بیمار لوگوں کا اچھا علاج کروں گی۔
عشرہ امین، لاہور
میں سیاست دان بن کر اپنے ملک کے حالات سدھاروں گی۔
ماہ رخ ایمان، اسلام آباد
میں ٹیچر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔
عبداللہ احمد، لاہور
میں بڑا ہو کر فوجی بنوں گا اور اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔
حمزہ عدنان، لاہور
میں آرمی آفیسر بن کر ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گا۔
زین العابدین، فیصل آباد
میں اچھا انسان بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کروں گا۔
محمد حسین اکرام، سرگودھا
میں بڑا ہو کر جہازوں کا انجینئر بنوں گا۔
شہریار رشید، اسلام آباد
میں پاک آرمی جوائن کروں گا۔
میں کرکٹر بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔
فاطمہ یونس، لاہور
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔
ابراہیم ظفر، ملتان
میں آرمی جوائن کر کے پاکستان کا دفاع کروں گا۔
نومبر 2014
25

ذہین لڑکا

ایک تھا لڑکا بڑا ذہین
نام تھا اُس کا بچو! معین
باتیں نئی نئی لکھ کر لاتا
پڑھ کر بچوں کو وہ سناتا
کام وہ اپنا وقت پر کرتا
ملتا سبق جو یاد وہ کرتا
پاس ہونے کا ہوتا یقین
محنت سے وہ جی نہ چراتا
خوشی خوشی اسکول کو جاتا
مار نہ وہ استاد سے کھاتا
جب بھی کرتا سوال استاد
سب سے پہلے ہاتھ اُٹھاتا
دیتا اکثر ٹھیک جواب
اور استاد سے داد وہ پاتا
میرے دیس کے نونہالو!
تم بھی محنت کو اپنا لو

(محمد شفیق اعوان، اٹک)

ایک دو تین

ایک دو تین
گھوڑا کاٹھی زین
تین کے آگے چار
گھوڑا ہے تیار
پانچ چھ سات
گھوڑا مارے لات
آٹھ نو دس
بس بے گھوڑے بس

(علینہ احمد، راول پنڈی)

علم

ظلمت جگ کی مٹاؤ
علم کی شمع جلاؤ
علم ہے نادر گہنا
دل سے لگائے رہنا
جو بچے پڑھتے ہیں
وہ آگے بڑھتے ہیں
علم ہے ایک سمندر
سب ہیں اس کے اندر
قسمت صرف اس کی جاگے
پیچھے جو اس کے بھاگے
علم سے رب ملتا ہے
اس سے کون جدا ہے

(محمد کلیم بھکر، حافظ آباد)

عقل ہو تو......

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو زمین پر بھیجا تو حضرت جبرائیلؑ خدائے واحد کی طرف سے تین چیزیں عقل، دین اور حیاء لے کر آئے اور حضرت آدمؑ کو کہا کہ ان تینوں میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کریں تو حضرت آدمؑ نے دین اور حیاء کو چھوڑ کر عقل کو ترجیح دی کیوں کہ عقل سے دونوں چیزیں دین اور حیاء حاصل ہو جاتی ہیں۔

(کشف طاہر، لاہور)

مثالِ دُنیا

ایک قافلہ اندھیری سرنگ سے گزر رہا تھا کہ ان کے پاؤں میں کنکریاں چبھیں، کچھ لوگوں نے اس خیال سے کہ یہ کسی اور کو نہ چبھ جائیں۔ اُٹھا کر رکھ لیں۔ کچھ نے زیادہ اُٹھائیں، کچھ نے کم اور کچھ نے اُٹھائی ہی نہیں۔ جب قافلہ اندھیری سرنگ سے باہر آیا تو دیکھا کہ وہ ہیرے تھے۔ جنھوں نے کم اُٹھائیں، وہ پچھتائے کہ کم کیوں اُٹھائیں۔ جنھوں نے نہیں اُٹھائیں وہ اور بھی پچھتائے۔

دُنیا کی زندگی کی مثال اسی اندھیری سرنگ کی سی ہے اور نیکیاں یہاں کنکریوں کی مانند ہیں۔ اس زندگی میں جو نیکی کی، وہ آخرت میں ہیرے جیسی قیمتی ہوں گی اور انسان ترسے گا کہ اور زیادہ نیکیاں کیوں نہیں کیں۔

(دعا اعظم، شیخوپورہ)

سونا اور ہیرا

ایک دفعہ کسی نے شیخ سعدیؒ سے پوچھا: ''دوست اور بھائی کی مثال کیسے ہے؟'' شیخ سعدیؒ نے کہا: ''دوست ہیرے کی مانند اور بھائی سونے کی مانند ہوتا ہے۔''

وہ آدمی بڑا حیران ہوا، کہنے لگا: ''خونی رشتہ یعنی بھائی کو آپ سونے سے تشبیہ دے رہے ہیں جب کہ دوست کو اس سے زیادہ قیمتی ہیرے سے تشبیہ دے رہے ہیں۔''

آپؒ نے کہا: ''بھائی کو سونے کی طرح اس لیے کہا کہ اگر سونا ٹوٹ جائے تو پگھلا کر اصلی حالت میں لایا جا سکتا ہے یعنی بھائی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہو تو وہ جلد ختم ہو جاتا ہے اور دوست کو ہیرا اس لیے کہا کہ اگر ہیرا ٹوٹ جائے تو پھر اپنی اصلی حالت میں کبھی

نہیں آ سکتا۔ یعنی اگر دوست کے ساتھ دشمنی پیدا ہو جائے تو پھر دوستی نہیں ہو سکتی۔ (صبیح الحسن، تنویر احمد، سیال کوٹ)

قرآن مجید پڑھنے کے فائدے

- شفاء کے لیے پڑھتے ہیں، بلاشبہ اس میں شفاء ہے۔
- حادثات و مصیبتوں سے بچاؤ کے لیے پڑھتے ہیں۔
- حصولِ رزق اور رزق بڑھانے کے لیے اسے پڑھا جاتا ہے۔
- جہنم اور عذابِ قبر سے بچنے کے لیے اسے پڑھا جاتا ہے۔
- راحت اور دل کو سکون پہنچانے کے لیے اسے پڑھا جاتا ہے۔
- ثواب حاصل کرنے کے لیے اسے پڑھا جاتا ہے۔
- برکت کے لیے پڑھتے ہیں، بلاشبہ اس کے پڑھنے سے برکت ہوتی ہے۔ (رانا اسامہ شبیر، بھکر)

کام کی باتیں

- کسی کو اچھے عمل سے خوشی دینا، ہزار سجدے کرنے سے بہتر ہے۔
- موتی اگر کیچڑ میں بھی گر جائے تو قیمتی ہے اور گرد اگر آسمان پر بھی چڑھ جائے تو بھی بے قیمت ہے۔
- جوانی امیدوں پر زندہ رہتی ہے جب کہ بڑھاپا ماضی کی یادوں میں۔
- خیرات گھر سے شروع ہونی چاہیے لیکن گھر میں ختم نہیں ہونی چاہیے۔
- صبر کا ہر قدم کام یابی کی طرف بڑھتا ہے۔
- انسان کا سب سے بڑا بوجھ غصہ ہے۔
- آسمان پر نگاہ ضرور رکھو، مگر یہ مت بھولو کہ پاؤں زمین پر ہی رہیں۔
- خالی برتن زیادہ آواز کرتا ہے۔ (محمد حمزہ سعید، بورے والا)

سنہرے موتی

- رات کو بھوکا سو جانا، صبح قرض دار اُٹھنے سے بہتر ہے۔
- جو شخص ناممکن کے پیچھے بھاگتا ہے، وہ ممکن سے بھی رہ جاتا ہے۔
- سچ کہہ دینے سے دین کو خلفشار سے نجات مل جاتی ہے۔
- تحریر ہی وہ چیز ہے، جو زندہ رہتی ہے۔

(محمد حسن شاہد، ڈیرہ غازی خان)

حضور اکرمؐ کی حضرت انسؓ کو پانچ نصیحتیں

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی اکرمؐ نے پانچ باتوں کی وصیت فرمائی:

- اے انسؓ! کامل وضو کرو، تمہاری عمر بڑھے گی۔
- جو میرا امتی ملے، سلام کرو، نیکیاں بڑھیں گی۔
- گھر میں سلام کر کے جایا کرو، گھر کی خیریت بڑھے گی۔
- چاشت کی نماز پڑھتے رہو، تم سے پہلے لوگ جو اللہ والے بن گئے تھے، ان کا یہی طریقہ تھا۔
- چھوٹوں پر رحم کر، بڑوں کی عزت کر، تو قیامت کے دن میرا ساتھی ہوگا۔ (حافظ محمد اسامہ طاہر، چونی)

اقوالِ زریں

- کامیابی حوصلوں سے ملتی ہے اور حوصلے دوستوں سے ملتے ہیں۔ دوست مقدروں سے ملتے ہیں اور مقدر انسان خود بناتا ہے۔
- اچھا دوست چاہے کتنا بھی بُرا بن جائے، کبھی اس سے دوستی مت توڑنا کیوں کہ پانی چاہے جتنا بھی گندا ہو جائے، آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔
- لاکھوں کو دوست بنانا کوئی بڑی بات نہیں، بڑی بات یہ ہے کہ ایسا دوست بناؤ جو تمہارا اس وقت ساتھ دے جب لاکھوں تمہارے مخالف ہوں۔
- لوگوں کو دعا کے لیے کہنے سے زیادہ بہتر ہے، ایسا عمل کرو کہ لوگوں کے دل سے آپ کے لیے دعا نکلے۔
- کوئی آئینہ انسان کی اتنی سچی تصویر پیش نہیں کر سکتا جتنی کے اس کی گفتگو۔ (احمد نسیم شیروان، ایبٹ آباد)

سنہری باتیں

- علم سیکھو..........شوق سے۔
- والدین کی خدمت کرو..........خلوص کے ساتھ۔
- بات کرو..........تمیز کے ساتھ۔
- محبت کرو..........اللہ اور رسولؐ کے ساتھ۔
- غصہ پی جاؤ..........تحمل کے ساتھ۔
- جہاں بیٹھو..........سلیقے کے ساتھ۔
- ملازمت کرو..........دیانت داری کے ساتھ۔
- بحث کرو..........دلیل کے ساتھ۔
- بیٹھو تو..........اللہ والوں کے ساتھ۔
- دوستی کرو..........علم کے ساتھ۔ (محمد حنظلہ سعید، فیصل آباد)

رافعہ نے بڑا سا گول بینگن دھو کر تھالی میں رکھا۔ لے کر جو چلی تو بینگن لڑھک کر نیچے گر پڑا۔ اس نے زمین پر سے اُٹھا کر دوبارہ دھویا اور اسی تھالی میں رکھا۔ اب جو چلی تو بینگن نے پھر ایک لڑھکنی کھائی اور زمین پر آ رہا۔ رافعہ نے جھنجھلا کر کہا: ''عجیب بینگن ہے، اسے ایک جگہ قرار ہی نہیں۔'' ساس نے کہا: ''بیٹی! سپاٹ تھالی میں تو یہ لڑھکے گا ہی، اسے گہری پلیٹ میں رکھو۔''

اتنے میں رافعہ کا شوہر باہر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلا اور اس سے کہنے لگا: ''میں تم لوگوں کے ساتھ شادی پر نہیں جا سکوں گا کیوں کہ مجھے ایک دوست کے ہاں دعوت پر جانا ہے۔''

''مگر کل تو آپ نے ہمارے ساتھ شادی پر جانے کا پکا وعدہ کیا تھا۔'' رافعہ منہ بسور کر بولی۔

''مگر اب میں نے ارادہ بدل لیا ہے، میں نے دوست کے ہاں جانا ہے بس!'' شوہر نے خفا ہو کر کہا۔

وہ چپ ہو گئی۔ اتنے ہی میں اس کا بڑا بیٹا آیا۔

''امی! یہ کیا پکانے لگی ہیں؟ میں نے بینگن نہیں کھانے، میں آلو کھاؤں گا۔'' لڑکے نے بضد ہو کر کہا۔

''ارے! ابھی تو تم نے ناشتے پر کہا تھا کہ بینگن ٹماٹر پکاؤ چاولوں کے ساتھ۔'' ماں نے حیران ہو کر اُس کی طرف دیکھا۔

''مگر اب میرا دل نہیں چاہ رہا، آپ آلو پکائیں۔'' لڑکے نے مزید اصرار کر کے کہا۔ رافعہ بے چاری زِچ ہو کر رہ گئی۔ بینگن کا لڑھک کر کبھی اِدھر کبھی اُدھر گرنا ابھی اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اسے شوہر اور بیٹے کے یہ تیزی سے بدلتے ہوئے خیالات بینگن کے لڑھکنے کی طرح محسوس ہوئے تو اس نے بے ساختہ بیٹے سے کہا:

''تم بھی تو باپ کی طرح تھالی کے بینگن ہو، جو ایک جگہ قائم ہی نہیں رہ سکتا۔''

ایسی صورتِ حال میں جب کوئی شخص اپنی بات پر قائم نہ رہ سکے اور بار بار اپنا فیصلہ بدلے، اُسے تھالی کا بینگن کہتے ہیں۔

گل داؤدی (Chrysanthemum) کو ماہ نومبر کا پھول کہا جاتا ہے۔ یہ چین کا قومی پھول ہے۔ اس کا تعلق "Asteraceae" خاندان سے ہے۔ اس کا لفظی مطلب سونا (Gold) پھول ہے۔ یہ

سدا بہار پودا ہے جس کو خوش نما پھول کی وجہ سے اُگایا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے 1500 سال قبل سے یہ پھول لگایا جا رہا ہے۔ جاپان اور چین کے لوگ اس پھول سے جوس تیار کرتے ہیں۔ ان کے پھولوں میں "Pyrethrins" نامی کیمیکل حشرات کو ہلاک کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ بلجیئم، اٹلی، اسپین، پولینڈ اور ہنگری کے لوگ جنازے پر یہ پھول ڈالتے ہیں جب کہ چین، جاپان اور کوریا کے لوگ خوشی کے موقع پر انہیں استعمال کرتے ہیں۔ پودا سائز میں 0.2 سے 2 میٹر تک اونچا ہوتا ہے۔ 20 سے 25 سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر یہ پودا خوب نمو پاتا ہے۔

بچھو (Scorpion) ایک زہریلا کیڑا ہے جس کا تعلق فائیلم آرتھروپوڈا (Arthropoda) سے ہے۔ یہ صحرا، گلے سڑے پتے اور گوبر وغیرہ کے پاس رہتا ہے۔ ان کی آٹھ ٹانگیں ہوتی ہیں۔ ان کی دُم پر زہریلا ڈنک ہوتا ہے۔ یہ کیڑا ہماری زمین پر 430 ملین سال پہلے آیا۔ ان کی جسامت 9 ملی میٹر سے 20 سینٹی میٹر تک ہوتی ہے۔ بچھو کی 1750 انواع (Species) ہیں جن میں سے 25 نہایت زہریلی اقسام ہیں۔ سوائے براعظم انٹارکٹیکا کے یہ پوری دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ بچھو کے ڈنک کو "Aculeus" کہا جاتا ہے جب کہ دُم کو "Metasoma" کہتے ہیں۔ اس کے ڈنک

سے حاصل ہونے والا زہر ادویات میں استعمال ہوتا ہے۔ بچھو کو نومبر کے مہینے کا جانور بھی سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے نومبر میں پیدا ہونے والے افراد کو "Scorpion" کہا جاتا ہے۔ اس جانور پر محاورے، کہانیاں اور فلمیں بھی بنائی گئی ہیں۔ کچھ کمپنیوں نے بچھو کو بطور نشان بھی اختیار کر رکھا ہے۔

کے جلنے سے فضائی آلودگی پیدا ہوتی ہے۔

پیٹرول

پیٹرول (Petrol) ایک فوسل ایندھن (Fuel) ہے جو زمین سے نکلتا ہے۔ یہ نامیاتی مرکب ہے جو ہزاروں لاکھوں سال قبل دفن ہو جانے والے درختوں کی ٹوٹ پھوٹ (Decomposition) سے بنا۔ زمین سے نکلتے وقت اس میں کئی اور اشیاء کی آمیزش بھی ہوتی ہے مثلاً قدرتی گیس، مٹی کا تیل، پیرافین (Paraffin) اور اسفالٹ وغیرہ شامل ہیں۔ پیٹرول یا پیٹرولیم دو لاطینی حروف

"Petro" اور "Oleum" سے لیا گیا ہے۔ پیٹرو کا مطلب ہے ''چٹان'' اور اولیم کا مطلب ہے ''تیل۔'' چٹان سے نکلتے ہوئے یہ کالے رنگ کا ہوتا ہے، اس وقت یہ "Crude Oil" کہلاتا ہے۔ آئل ریفائنری (Oil Refinery) میں اس کی صفائی ہوتی ہے۔ پاکستان میں کراچی، اٹک اور ملتان میں تیل صاف کرنے کے کارخانے قائم ہیں۔ پیٹرول دُنیا میں سب سے زیادہ استعمال ہونے والا ایندھن ہے۔ سعودی عرب، عراق، ایران، لیبیا، کویت، وینزویلا وغیرہ دُنیا میں پیٹرول پیدا کرنے والے بڑے ممالک ہیں جب کہ امریکہ، چین، بھارت، انڈونیشیا اور پاکستان وغیرہ پیٹرول استعمال کرنے والے بڑے بڑے ممالک ہیں۔ پیٹرولیم کی عالمی منڈی میں تجارت کو کنٹرول کرنے والے ادارے کو اوپیک کہا جاتا ہے۔ اس میں تیل پیدا کرنے والے ممالک شامل ہیں۔ پیٹرول

پلاسٹک سرجری

پلاسٹک سرجری (Plastic Surgery) ایک ایسا طریقۂ علاج ہے جس کی مدد سے زخموں کے نشان، موٹے ہونٹ، موٹی ناک، بڑے کان وغیرہ کو خوب صورتی میں بدل دیا جاتا ہے۔ لفظ پلاسٹک سرجری دراصل یونانی زبان پلاسٹیکرز سے نکلا ہے۔ اس کے معنی ہیں دوبارہ بنانا، موڑ دینا یا اگانا وغیرہ کے ہیں۔ حادثات، لڑائی جھگڑے، بھدے پن یا پیدائشی بدصورتی کو ختم کرنے کے

لیے اس تکنیک کا آغاز 600 قبل مسیح کو ہوا۔ پہلی مرتبہ بھارت کے ایک مسیحائی فادر سشر تا سمیتا نے اس طریقۂ علاج کے اصول وضع کیے۔ 1594ء میں بلونا یونیورسٹی کے پروفیسر گیسپر ٹگیا کوزی نے پلاسٹک سرجری پر کتاب لکھ کر سائنسی اصول وضع کیے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد اس علاج نے تیزی سے ترقی پائی۔ 1794ء سے برطانیہ میں پولیس مقابلوں میں زخمی مجرموں کی سرجری شروع کی گئی۔ 1960ء میں سیلیکون (Silicon) کے استعمال سے مصنوعی اعضا بننے کا عمل شروع ہوا۔ دُنیا کی کئی نامور شخصیات نے اس تکنیک سے فائدہ اٹھایا جن میں شہنشاہ جسٹینین، امریکن اداکارہ پک فورڈ، پاکستانی گلوکارہ ملکہ ترنم نور جہاں، اداکارہ ایتابھ اداکارہ ایشوریہ، امریکہ کے معروف گلوکار مائیکل جیکسن وغیرہ نے اس علاج سے فائدہ اٹھایا۔ پاکستان میں بھی یہ طریقۂ علاج مقبول ہو رہا ہے۔ ☆☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ 9 ہجری میں کس فرض کی ادائیگی کا حکم نازل فرمایا گیا؟

i۔ حج ii۔ نماز iii۔ روزہ

2۔ حضرت سلیمانؑ نے کس مشہور مسجد کی بنیاد رکھی تھی؟

i۔ مسجد اقصیٰ ii۔ مسجد ضرار iii۔ مسجد قبا

3۔ عام شیشے کا کیمیائی نام کیا ہے؟

i۔ سوڈیم ٹرائی سلیکیٹ ii۔ سوڈیم کلورائیڈ iii۔ سوڈیم سلفائیڈ

4۔ دنیا کی مشہور و معروف نہر پانامہ کس ملک میں ہے؟

i۔ پیرو ii۔ چلی iii۔ پانامہ

5۔ مسدس کا ہر بند کتنے مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے؟

i۔ 8 مصرعے ii۔ 4 مصرعے iii۔ 6 مصرعے

6۔ نیٹ بال کے کھیل میں ایک ٹیم کتنے کھلاڑیوں پر مشتمل ہوتی ہے؟

i۔ 6 کھلاڑی ii۔ 7 کھلاڑی iii۔ 9 کھلاڑی

7۔ ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ارم بن گیا دامنِ کوہ سار

یہ شعر بالِ جبریل کی کس نظم سے لیا گیا ہیں؟

i۔ فرمانِ خدا ii۔ ساقی نامہ iii۔ شکوہ

8۔ طالب کا مطلب چاہنے والا، اس کی جمع کیا ہے؟

i۔ مطلوب ii۔ طلّاب iii۔ طالبین

9۔ طوطیٔ ہند کسے کہا جاتا ہے؟

i۔ امیر خسرو ii۔ تان سین iii۔ بیربل

10۔ دنیا کی کس مشہور مسجد میں پورے سال میں صرف دو فرض نمازیں پڑھائی جاتی ہیں؟

i۔ مسجد قبا ii۔ مسجد نمرہ iii۔ مسجد جمعہ

جوابات علمی آزمائش اکتوبر 2014ء

1۔ کلمۂ توحید 2۔ فتح مبین 3۔ 36 سینٹی گریڈ 4۔ میسوپوٹیما 5۔ بالِ جبریل 6۔ قتیل شفائی 7۔ اسلم کمال 8۔ Puck 9۔ وارث النبی فی الہند 10۔ مولوی عبدالحق

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ زنیرہ خان، کراچی (150 روپے کی کتب)

☆ آصف علی، لاہور (100 روپے کی کتب)

☆ مریم رضوان، راول پنڈی (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:

محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ محمد ذیشان، راول پنڈی۔ تحریم معراج، لاہور۔ محمد عمر فاروق، بھکر۔ عمیر محمود، اوکاڑہ۔ محمد سلمان، گجرات۔ ولید احمد، گوجرانوالہ۔ اشرف، میانوالی۔ عائشہ صدیقہ، پشاور۔ حفصہ اعجاز، باڑہ ہملٹ۔ ندا خان، پشاور۔ عقیلہ رباب، تلہ گنگ۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ خدیجہ نشان، کامونکی۔ حسن رضا سردار، کامونکی۔ محمد شادمان صابر، لاہور۔ فاطمہ صغیر، منڈی بہاؤ الدین۔ زینب محبوب، جہلم۔ احد غفران، گوجرانوالہ۔ عارف نعیم، لاہور۔ کومل صادق، گوجرانوالہ۔ افراح سجاد، راول پنڈی۔ عائشہ مجید، لاہور۔ محمد قمر الزماں، خوشاب۔ محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ محمد احمد، ڈیرہ اسماعیل خان۔ عبداللہ شاہ، دریا خان۔ حضرتیٰ حیات، جمرود۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ مہر النساء واحد، لاہور۔ عائشہ سلام، اسلام آباد۔ صفورا احمد، ملتان۔ راحیلہ قربان، جہلم۔ عارف الٰہی، لاہور۔ نادیہ خان، پشاور۔ رانا شعیب احمد، لاہور۔ شازیہ خان، پشاور۔ شفیق رضوی، لاہور۔ ظہور اخلاق احمد، کراچی۔ ظفر انوار، حیدر آباد۔ طارق ریاض خان، لاہور۔ فیض سعید، لاہور۔ عابد سجاد، مری۔ عدیل سلیم، کسووال۔ دلشاد احمد، ایبٹ آباد۔ اسلم نعمان، کوہاٹ۔ سلیم الدین احمد، سیال کوٹ۔ سعدیہ اشفاق، گڑھی حبیب اللہ۔ زبیر الدین، فیصل آباد۔ اسماعیل خواجہ، لاہور۔ عطیہ اشفاق، اوکاڑہ۔ محمد شریف خان، جہلم۔ عاطف انور، کراچی۔ احد خان، کوہاٹ۔

چپلی کباب

اجزاء:

گائے کا قیمہ:	آدھا کلو	بیسن:	تین کھانے کے چمچ	دھنیا:	دو کھانے کے چمچ (کٹا ہوا)
انار دانہ:	دو کھانے کے چمچ	لال مرچ:	دو کھانے کے چمچ (کُٹی ہوئی)	ہلدی:	ایک کھانے کا چمچ (پسی ہوئی)
گرم مصالحہ:	ایک کھانے کا چمچ (پسا ہوا)	نمک:	حسب ذائقہ	ٹماٹر:	دو عدد
پیاز:	دو عدد	ہری مرچ:	پانچ عدد	ہرا دھنیا:	ایک چوتھائی گٹھی
انڈہ:	ایک عدد	سفید مکھن:	دو کھانے کے چمچ	تیل:	آدھا لیٹر

ترکیب: قیمے میں بیسن، دھنیا، انار دانہ، کُٹی لال مرچ، پسی ہلدی، پسا گرم مصالحہ اور نمک شامل کر دیں۔ اب ٹماٹر، پیاز، ہری مرچ اور ہرا دھنیا کاٹ کر ڈال دیں۔ پھر انڈہ اور مکھن ڈال کر اچھی طرح مکس کریں۔ آخر میں بڑے کباب کی شکل دے کر ہلکی آنچ پر کھلے توے پر فرائی کر لیں۔

سجی (کوئٹہ اسپیشل)

اجزاء:

ران سالم:	ڈیڑھ کلو (ایک عدد)	ادرک پسی ہوئی:	ایک کھانے کا چمچ	سفید سرکہ:	آدھی بوتل (چھوٹی)
لیمن جوس:	آدھا کپ (اوپر ڈالنے کے لیے)	لیمن جوس:	ایک چوتھائی کپ	لہسن:	پسا ہوا (ایک کھانے کا چمچ)
گوشت گلانے کا پاؤڈر:	ایک کھانے کا چمچ	چاٹ مصالحہ اوپر ڈالنے کے لیے			

ترکیب: ران کو اچھی طرح دھو کر اس پر چھری سے کٹ لگائیں اور بڑے دیگچے میں پانی ڈال کر اس میں ران کو ڈبو دیں اور آدھے گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس کے بعد اسی پانی میں آدھا کپ لیمن جوس، نمک، ادرک، لہسن، سفید سرکہ اور گوشت گلانے کا پاؤڈر ڈال کر ایک دو گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ اس دیگچے میں سے آدھا پانی نکال دیں اور بقیہ پانی میں ران کو تھوڑا سا اُبال لیں۔ اس کے بعد سیخ میں پرو کر کوئلے کی آنچ پر سینک لیں۔ تیار ہونے پر چاٹ مصالحہ اور لیمن جوس اوپر چھڑک کر گرم گرم مہمانوں کو پیش کریں۔

پندرہ برس پہلے ہم لوگ نارووال میں رہائش پذیر تھے جو کہ ہمارا آبائی شہر تھا۔ ہمارا تین منزلہ مکان تھا جو کہ میرے دادا جان کو وراثت میں ملا تھا۔ خاصا بڑا اور ہوا دار تھا۔ نیچے والی منزل پر ہم لوگ، دوسری منزل پر ہمارے تایا اور سب سے اوپر والی منزل پر میرے چچا رہتے تھے۔ میرے تایا کے تین بچے تھے اور چچا کے دو جب کہ ہم لوگ چار بہن بھائی تھے۔ شانی بھائی، گڑیا آپا اور بانو باجی چونکہ اب بڑے ہو چکے تھے، لہٰذا وہ ہمارے ساتھ نہیں کھیلتے تھے۔ باقی بچے جن میں مَیں، نازو، عافیہ، چیکو، نومی اور ببلو شامل تھے، مل کر خوب دھما چوکڑی مچاتے تھے۔ ہماری گلی میں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون رہتی تھی جن کا نام تو کچھ بھلا سا تھا مگر لوگ انہیں خالہ کہتے تھے۔ بڑوں کو تو ان سے کوئی پریشانی نہیں تھی مگر بچے ان سے سخت نالاں رہتے تھے کیوں کہ جب بھی کوئی بچہ شرارت کرتا تو ڈانٹ دیتی مگر انہوں نے کبھی کسی کو مارا نہ تھا۔ ایک دفعہ نومی نے نہایت غلط حرکت کی۔ اس نے ایک اندھے فقیر کو یہ کہہ کر کہ وہ سڑک کے کنارے کھڑا ہے، اسے سڑک کے عین بیچ میں لا کھڑا کیا۔ وہ تو شکر ہے کہ اس وقت کسی نے اس فقیر کو روڈ پار کروا دی ورنہ تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ اس کے علاوہ جب نومی یہ حرکت کر رہا تھا تو خالہ نے دیکھ لیا۔ اس وقت وہ سبزی والے سے بھاؤ تاؤ کرنے میں مصروف تھیں۔ فوراً بھاگی بھاگی آئیں اور نومی کے منہ پر تھپڑ رسید کر کے بولیں۔ ”آئندہ کرو گے ایسا؟“ نومی چپ رہا۔ انہوں نے پھر پوچھا۔ ”کرو گے ایسا؟ بولو!“ نومی نے جواب دیا۔ ”نہیں کروں گا۔“ خالہ کہنے لگیں۔ ”شرم کرو تمہیں تو چاہیے تھا کہ اس بے چارے کی مدد کرو، الٹا تم نے اس کو مصیبت میں ڈال دیا۔“ یہ کہہ کر وہ واپس جانے کے لیے مڑ گئیں۔ ہمیں ان پر بڑا غصہ آیا۔ ہم کہنے لگے کہ یہ تو ہمیں شرارتیں بھی نہیں کرنے دیتیں۔ جیسے ہی ہم گھر میں داخل ہوئے تو سامنے برآمدے میں ابا جان بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمارے لٹکے ہوئے چہرے دیکھ کر وہ بھانپ گئے کہ ضرور کوئی مسئلہ ہے۔ انہوں نے ہم سے دریافت کیا۔ ہم نے ساری بات ان کو مصالحے لگا کر بتائی۔ ساری بات سن کر ابا جان اُٹھے اور نومی کو بُری طرح ڈانٹنے لگے۔ ہماری تو وہ حالت ہو گئی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ اس دن کے بعد ہمارے دل میں خالہ کے لیے عداوت پیدا ہو گئی۔ ہم لوگ اکثر انہیں تنگ کرنے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے۔ وہ اپنے گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ خدا نے انہیں اولاد کی نعمت سے محروم رکھا جب کہ ان کے شوہر بہت پہلے وفات پا چکے تھے۔ ان کی

خواہش تھی کہ وہ بیت اللہ کی زیارت کریں مگر ہماری وجہ سے وہ ایسا نہ کر پائیں اور مجھے اس کا پچھتاوا ساری زندگی رہے گا۔ دراصل ہوا کچھ یوں کہ انہیں حج کے لیے سعودی عرب دن بارہ بجے کی فلائٹ سے روانہ ہونا تھا۔ ہم ان کے گھر ان سے ملنے کے بہانے گئے۔ ایسے میں وہ کسی کام کے لیے کمرے سے باہر گئیں اور ہم نے جھٹ سے ان کی گھڑی کا وقت ایک گھنٹا پیچھے کر دیا۔ اتنے میں وہ واپس آئیں اور گھڑی پر ان کی نظر پڑی۔ وہ تھوڑا تذبذب کا شکار ہوئیں اور کہنے لگیں۔ ''ہائیں! یہ کیا ابھی گیارہ بجے تھے اور اب دس بج رہے ہیں۔'' میرے ذہن میں جھماکے سے ایک خیال آیا۔ میں جھٹ سے بولی۔ ''خالہ! آپ جس مقدس مقام کی زیارت کے لیے جانے لگی ہیں، اس کے لیے بندہ کہتا ہے کہ فوراً پر لگا کر پہنچ جائے۔ ایسا لگتا ہے کہ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے، جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ آپ ہماری گھڑیوں سے دیکھ لیں ابھی دس ہی بجے ہیں۔'' خالہ کی حیرت میں کمی واقع ہوئی اور وہ ہنس دیں۔ ''ارے واقعی بچو، تم صحیح کہتے ہو۔ اس عمر میں تو ویسے ہی دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔'' ہم نے بھی خالہ کی ہاں میں ہاں ملائی اور ہنستے ہوئے چل دیے۔ باہر نکلتے ہی ہم نے بلند بانگ قہقہہ لگایا اور اپنی فتح پر ناز کرنے لگے۔ بے چاری بھولی بھالی خالہ ہمارے ہاتھوں بے وقوف بن گئیں اور حج کی سعادت سے محروم رہ گئیں۔ اتنا کچھ ان کے ساتھ کرنے کے باوجود بھی ہم یہ دعائیں کرتے رہتے کہ اللہ جی خالہ کو بیمار کر دے تاکہ ہم باآسانی گلی میں گھوم پھر سکیں اور دل کھول کر شرارتیں کر سکیں مگر خالہ شاید ہی کبھی بیمار ہوئی ہوں۔ وہ اکثر ہمیں کھانے پینے کی چیزیں بھی دیتیں مگر ہم ان سے کبھی راضی نہ ہوئے۔ ہم سارے بچوں کے امتحانات جون کے آخر میں ختم ہو گئے۔ پہلے کچھ دن تک تو ہم کو مزہ آتا رہا مگر پھر ہم ہر چیز سے اُکتا گئے۔ ایک دن ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ میں نازو کو لے کر گھر کی پچھلی طرف چلی گئی جہاں پر پہلے تو ایک کمرہ تھا مگر اب وہاں خالی ایک دیوار ہی رہ گئی تھی۔ میں اور نازو کھیل رہے تھے کہ نازو اچانک گر پڑی۔ وہ اب کھیلنے کے قابل نہ تھی، لہٰذا میں اسے سہارا دے کر نانی کے پاس لے گئی۔ اسے گھر چھوڑنے کے بعد میں واپس اسی جگہ پر آ گئی اور دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اور سہانے موسم سے لطف اندوز ہونے لگی

کہ اچانک پوری دیوار دھڑام سے میرے اوپر آ گری اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ ہوش میں آنے پر اپنے آپ کو اسپتال کے بستر پر پایا۔ میرا جسم پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا اور سر میں درد کی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ میرے اردگرد امی، آپا اور تائی جان کھڑی تھیں۔ مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر سب کی باچھیں کھل اُٹھیں۔ میں نے باجی سے پوچھا کہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ دیوار میرے اوپر کیسے گری ہے۔ باجی بولی۔ ''تم ابھی زیادہ بولو مت۔ میں بعد میں تفصیل بتاؤں گی۔'' میں خود نقاہت محسوس کر رہی تھی، لہٰذا میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ اتنے میں نرس آئی اور مجھے نیند کی گولی دے کر چلی گئی۔ اگلے دن صبح کے وقت میری آنکھ کھلی تو میں خود کو خاصا بہتر محسوس کر رہی تھی۔ چار دن بعد مجھے اسپتال سے چھٹی مل گئی۔ سب لوگ میرے لیے دعا کر رہے تھے کہ میں جلد از جلد صحت یاب ہو جاؤں۔ ہفتے بعد جب میں بیٹھنے کے قابل ہوئی تو میں نے باجی کو اپنا سوال دہرایا تو وہ بولیں کہ جب تم پہ دیوار گری تو کافی زوردار آواز آئی۔ ہم سمجھے کہ ٹائر پھٹا ہے۔ وہ تو بھلا ہو خالہ کا کہ ان کی نظر اپنی کھڑکی سے ہمارے گھر پر پڑی تو وہ بھاگم بھاگ ہمارے ہاں پہنچیں اور تمہارے دیوار گرنے کی اطلاع دی۔ ہم جلدی سے وہاں پہنچے۔ ابو نے ریسکیو 1122 والوں کو فون کیا تو وہ چند ہی منٹوں میں پہنچ گئے اور تمہیں ملبے کے نیچے سے نکالا اور زخمی حالت میں اسپتال پہنچایا۔ امی کی حالت سنبھل ہی نہیں رہی تھی۔ چچی اور خالہ نے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ ہم خود بھی فوراً اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ تمہارا بلڈ گروپ خالہ کے سوا کسی سے نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے فوراً آگے بڑھ کر خون دینے کی پیش کش کی مگر ڈاکٹروں نے انہیں عمر رسیدہ ہونے کے باعث خون دینے سے منع کرنے کی کوشش کی مگر خالہ نہ مانیں۔ انہوں نے فوراً کہا کہ آپ میری فکر نہ کیجیے، بس بچی کو خون لگا دیجیے۔ چنانچہ تمہیں خون لگا دیا گیا ورنہ ڈاکٹروں نے تو یہ خدشہ ظاہر کیا تھا کہ اگر وقت پر خون نہ لگایا جاتا تو خدانخواستہ.....'' باجی نے اپنا جملہ اُدھورا چھوڑ دیا اور خاموش ہو گئیں۔ مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور میں اپنی ہی نظروں میں گر گئی۔ میں سوچنے لگی کہ میں خالہ کو کتنا غلط سمجھتی تھی جب کہ وہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوئیں۔ میں ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور خالہ ہاتھ

میں یخنی کا ڈونگہ تھامے اندر داخل ہوئیں۔ میں ان سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ میں نے ان سے معافی مانگنا چاہی مگر اس وقت کہہ نہ سکی۔ میں نے انہیں دھیمی آواز میں سلام کیا جس کا انہوں نے نہایت شفقت سے جواب دیا۔ انہوں نے مجھے یخنی پلائی اور چلی گئیں۔ میں اکثر بستر پر لیٹے لیٹے خالہ کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

کچھ عرصے بعد میری حالت کافی حد تک بہتر ہوگئی اور میں خود سے اُٹھنے کے قابل ہوگئی، پھر بھی میں مکمل طور پر صحت یاب نہ ہو پائی۔ ایک دن میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور بہت اداس تھی۔ پھر یکایک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ میں نے باجی سے کہا کہ وہ مجھے قرآن پاک لا دیں۔ تھوڑی دیر میں قرآن مجید میرے ہاتھ میں تھا۔ پڑھتے پڑھتے میری نظر ایک آیت پر پڑی جس کا ترجمہ کچھ یوں تھا۔ ''بے شک گمان گناہ ہے۔'' مجھے احساس ہوا کہ میرے سے کتنا بڑا گناہ سرزد ہوگیا ہے جس کی تلافی مجھے ہر صورت کرنی ہوگی۔ نہ جانے مجھ میں اتنی طاقت کیسے آئی کہ میں خود کھڑی ہوگئی اور پاس پڑی بیساکھی کا سہارا لیتے ہوئے چل پڑی۔ ابھی میں دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ امی جان اندر داخل ہوئیں۔ وہ کہنے لگیں: ''ہیں گڑیا، یہ تم بستر سے کیوں اُٹھی ہو؟ کوئی چیز چاہیے تھی تو مجھے بتا دیتی۔ میں تو خود تمہارے پاس آ رہی تھی۔ باجی تو تمہارے پاس ہی ہوتی ہے، اسے کہہ دیتی۔'' میں نے کہا۔ ''امی جان! باجی نماز کے لیے کمرے سے باہر گئی تھیں۔'' امی نے جواب دیا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے مگر تم جا کہاں رہی ہو اور وہ بھی خود چل کر۔'' امی مجھے چلتا ہوا دیکھ کر بہت حیران بھی تھیں اور خوش بھی۔ میں نے کہا۔ ''اپنی کی گئی غلطیوں کا ازالہ کرنے۔'' یہ کہہ کر میں چل دی۔ امی نے کچھ کہنا چاہا مگر مجھے چلتا دیکھ کر ان کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔ وہ بس مجھے دیکھتی ہی رہیں۔

میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی خالہ کے چھوٹے سے گھر کے اندر داخل ہوئی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ وہ حیران ہوکر مجھے دیکھ ہی رہی تھیں کہ میں بول اُٹھی۔ ''خالہ مجھے معاف کر دیں۔'' یہ کہتے ہوئے میری آواز رندھ گئی۔ انہوں نے مجھ سے وجہ پوچھی تو میں نے ان کو ساری باتیں جو میں ان کے بارے میں سوچتی تھی اور جو شرارتیں ان کے ساتھ کی تھیں، انہیں بتا دیں۔ پہلے تو خالہ کے چہرے پر غم کے آثار نمایاں ہوئے مگر پھر وہ کہنے لگیں۔ ''گڑیا ایسا کبھی بھی کسی کے ساتھ نہ کرنا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے مجھے گلے سے لگا لیا، پھر وہ میرے ساتھ مجھے گھر تک چھوڑنے گئیں۔ اس واقعہ کو خاصا عرصہ گزر گیا ہے اور آج خالہ بھی اس دُنیا میں نہیں ہیں۔ میں خالہ کو کبھی نہیں بھول سکتی کیوں کہ وہ میری محسن ہیں اور محسنوں کو کبھی نہیں بھولتے۔

☆☆

کھوج لگائیے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

امی جان حسب معمول باورچی خانے میں دوپہر کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ آج انہوں نے مٹر پلاؤ بنانا تھا۔ وہ مٹر کی سبزی ایک ٹوکری میں ڈال کر باہر صحن میں پڑے تخت پوش پر بیٹھ گئیں۔ نعیم اور ارسم بھی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور امی جان کی مدد کرنے لگے۔ جب آدھی ٹوکری مٹر کے دانوں سے بھر گئی تو نعیم نے ارسم سے کہا کہ میری دونوں مٹھیوں میں کچھ مٹر کے دانے ہیں۔ اگر میں اپنی بائیں مٹھی سے تین دانے اپنی دائیں مٹھی میں منتقل کر دوں تو میری دونوں مٹھیوں میں دانوں کی تعداد برابر ہو جائے گی لیکن اگر میں اپنی بائیں مٹھی کے نصف دانے دائیں مٹھی میں منتقل کر دوں تو میری دائیں مٹھی میں بائیں مٹھی سے دگنے دانے ہو جائیں گے۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ نعیم کی بائیں مٹھی میں کتنے مٹر کے دانے ہیں؟
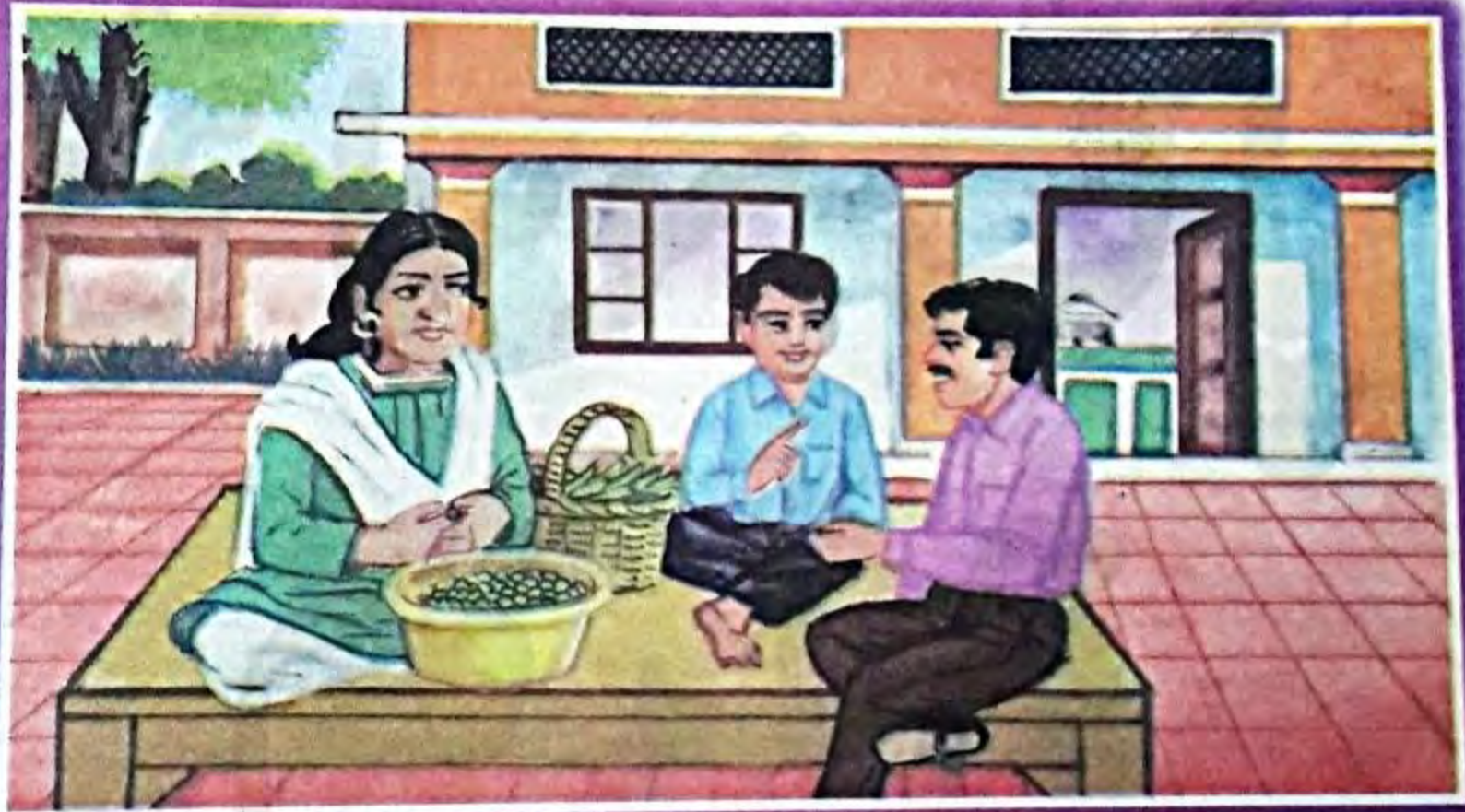
پیارے بچو! جواب تو بہت آسان ہے۔ آپ بھی دماغ پر زور ڈالیے اور درست جواب لکھ کر بھیجیے۔

اکتوبر 2014ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگائیے" کا صحیح جواب یہ ہے:

پیارے بچو! اکائی کا ہندسہ یوں لکھیں گے: 25 = 1 ,1 ,1 ,11 ,11

اکتوبر 2014ء کے کھوج لگائیے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- عائشہ مجید، لاہور
2- آمنہ اشرف، گوجرانوالہ
3- آمنہ سلام، اسلام آباد
4- افراح سجاد، راولپنڈی
5- تماضر ساجد، صادق آباد

سرسبز وشاداب کھیتوں میں گھرا ہوا یہ گاؤں اپنی خوب صورتی اور یہاں کے رہنے والے لوگوں کی خوش اخلاقیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ یہاں کے باشندے زیادہ تر کھیتی باڑی کر کے اپنا پیٹ پالتے تھے کیوں کہ گاؤں شہر سے کافی دُور تھا، اس لیے لوگوں کا شہر میں آنا جانا بہت ہی کم ہوتا تھا۔ اس گاؤں کا نمبردار فضل کریم جو کہ نہایت نیک اور پرہیزگار آدمی تھا، وہ گاؤں کے حالات سے ہمیشہ باخبر رہتا اور کوئی مسئلہ ہوتا تو وہ گاؤں کے بزرگوں سے صلاح ومشورہ کر کے جلد ہی نمٹا لیتا۔ ویسے بھی یہاں لڑائی بہت کم دیکھنے میں آتی تھی کیوں کہ یہاں سب امن پسند لوگ تھے۔

☆☆

کہتے ہیں بُرا وقت بتا کر نہیں آیا کرتا اور یہی اسی گاؤں کے ساتھ ہوا۔ ہوا یوں کہ جب لوگوں کی گندم کی فصل تیار ہو گئی تو سب لوگ اسے کاٹنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سب نے اپنی اپنی درانتیاں تیز کروالیں۔ ایک رات جب سب لوگ چین وسکون کی نیند سو رہے تھے تو اچانک گاؤں کے تمام اطراف سے دھواں اُٹھنے لگا۔ دھوئیں کے پھیلنے سے لوگوں کی نیندیں اُڑ گئیں۔ وہ گھبرا کر باہر کو دوڑے، آگ نے پورے گاؤں کی فصلوں کو لپیٹ میں لے لیا۔ تمام فصلیں چند لمحوں میں جل کر بھسم ہو چکی تھیں، سوائے راکھ کے کچھ نہ بچا۔ وہ رونے دھونے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔ پوری رات اسی دکھ میں گزار دی۔ صبح سب لوگوں نے اپنے اپنے کھیتوں کا رُخ کیا کہ شاید کچھ فصل جلنے سے بچ گئی ہو لیکن سوائے کالی زمین کے انہیں کچھ نہ نصیب ہوا۔

دن ڈھلے نمبردار فضل کریم نے تمام گاؤں والوں کو اپنے ڈیرے پر بلایا۔ جب بوڑھے بزرگ، بچے، نوجوان سب اکٹھے ہو گئے تو نمبردار فضل کریم نے کھڑے ہو کر بات کا آغاز کیا۔

میرے بزرگو اور نوجوانو! نقصان کسی ایک کا نہیں بلکہ پورے گاؤں کا ہوا ہے۔ رونے دھونے اور واویلا کرنے سے ہماری فصل ہمیں واپس نہیں ملے گی، لہٰذا ہمیں حوصلے اور بہادری سے کام لینا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آگ لگی کس طرح، کیا کسی نے جان بوجھ کر یہ آگ لگائی ہے یا یہ اتفاقیہ حادثہ ہوا ہے۔ مجمع کے تمام لوگوں نے اپنی رائے دی کہ یہ اتفاقیہ لگی ہے۔ کسی نے کہا کہ یہ سازش تھی۔ جب تمام لوگوں نے رائے بیان کی تو

فضل کریم بولا: ”جہاں تک میری سوچ ہے، یہ کسی کی سازش ہے جس کے ذریعے ہمیں اس طرح کنگال کیا گیا ہے۔ دشمن ہماری خوش حالی، آپس میں بھائی چارہ اور محبت نام کی کوئی چیز دیکھنا گوارہ نہیں کرتا اور یہ کسی ساتھ والے گاؤں کا کیا دھرا ہے۔“

ایک شخص بولا: ”یہ شرارت جس کی بھی ہے، اس کو سخت سے سخت سزا دی جائے۔“

نکڑ کے ایک شخص نے کہا: ”اسے بھوکے کتوں کا نوالا بنایا جائے تاکہ ایسی گستاخی کرنے کی کوئی آئندہ جرأت نہ کر سکے۔“

غرض ہر شخص نے اپنی اپنی رائے دی۔ جرح کافی دیر تک چلتی رہی لیکن کوئی اہم بات سامنے نہ آسکی کیوں کہ جس کسی نے بھی آگ لگائی تھی، اسے کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس مسئلے کا حل ناممکن نظر آرہا تھا۔ جب کوئی حل نہ نکلا اور کوئی مجرم سامنے نہ آیا تو یہ فیصلہ ہوا کہ آگ اتفاقیہ طور پر لگی ہے اور اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ دن گزرتے گئے اور لوگ اپنی نئی فصل کپاس میں ہمہ تن جت گئے۔ کپاس کی فصل کاشت ہوئی اور اختتام پذیر ہوگئی۔ اس وقت تک گاؤں والوں کے ذہن سے آگ والا واقعہ مٹ چکا تھا۔ کپاس کی فصل ختم ہوتے ہی لوگوں نے گندم بونے کی کوشش کی تاکہ ان کا اور ان کے بچوں کا پیٹ پالنے کا کوئی صحیح بندوبست ہو سکے، کیوں کہ ان کا گزارہ بڑی مشکل سے ہو رہا تھا۔ ☆☆

آہستہ آہستہ فصل تیار ہونے لگی اور چند دنوں بعد پک کر تیار ہوگئی، کسان بہت خوش تھے کیوں کہ اب ان کے بُرے حالات ختم ہونے والے تھے۔ وہ بڑی بے چینی سے فصل کاٹنے کے لیے اوزار تیار کرنے لگے۔ ماضی ان کے ذہنوں سے پوری طرح مٹ چکا تھا، اس لیے ان کو ذرا سا بھی خیال نہ تھا کہ تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی، مقدر کا کھیل ایک بار پھر ان کا دروازہ کھٹکھٹانے والا تھا۔ ☆☆

رات تقریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ اس وقت پورا گاؤں عالمِ خواب میں مست تھا۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا۔ کہیں کہیں سے کتوں کے بھونکنے کی آواز ماحول کو آسیب زدہ کر دیتی۔ اسی اثناء میں شہر سے گاؤں آنے والی سڑک پر سایہ کو چیرتی ہوئی موٹر سائیکل برآمد ہوئی جسے ایک نقاب پوش چلا رہا تھا۔ جونہی وہ گاؤں کے قریب آئی اس کی ہیڈ لائٹس بند ہوگئیں۔ آخر گاؤں سے کچھ فاصلے پر موٹر سائیکل رُک گئی اور نقاب پوش اتر گیا۔ اس نے موٹر سائیکل کا رُخ واپس شہر کی طرف کر دیا۔ نقاب پوش نے پکی ہوئی گندم کے قریب سگریٹ سلگائی، پھر وہی تیلی گندم میں پھینک دی۔ اِدھر نقاب پوش مزے سے سگریٹ کے دھوئیں کے چھلے بنانے لگا، اُدھر آگ پورے کھیتوں میں پھیلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے پورے گاؤں کی فصلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب آگ کے دھوئیں نے اثر کرنا شروع کیا تو لوگ ہڑبڑا کر اُٹھے اور باہر کی جانب دوڑے۔ جب انھوں نے آگ کو دیکھا تو وہ حیران و پریشان رہ گئے۔ موٹر سائیکل سوار کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ اُبھری۔ وہ تیزی سے موٹر سائیکل کی طرف مُڑنے لگا لیکن آج شاید مقدر اس کا ساتھ نہ دے رہا تھا۔ اس کے موٹر سائیکل تک پہنچنے سے پہلے ہی آگ موٹر سائیکل تک پہنچ گئی کیوں کہ سڑک کے ساتھ ساتھ گندم تھی۔ جونہی آگ اس جگہ پہنچی تو کئی چنگاریاں موٹر سائیکل کے اوپر جا گریں۔ آگ پلاسٹک کی نالی پر گری جہاں سے ٹینکی کے ذریعے پٹرول کی ترسیل ہوتی ہے تو وہ فوراً پگھل گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ نے موٹر سائیکل کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ ایک زور دار دھماکہ ہوا، موٹر سائیکل کے پرخچے اُڑ گئے۔ نقاب پوش گھبرا گیا اور وہ شہر کی طرف دوڑنے لگا لیکن اس وقت بہت دیر ہو چکی تھی۔ مختلف افراد کے ٹولے نے چوں کہ دھماکے کی آواز سن لی تھی اس لیے وہ فوراً سڑک کی طرف دوڑے۔ وہ نقاب پوش کو دیکھ چکے تھے، اس لیے اس کو پکڑنے کے لیے پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ نمبردار فضل کریم اور اس کے دونوں نوکر سب سے آگے تھے۔ نمبردار ادھیڑ عمری کے باوجود تیزی سے دوڑ رہا تھا کیوں کہ وہ مجرم کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ نقاب پوش بھاگتے بھاگتے اچانک پتھر سے ٹھوکر کھا کر گر گیا۔ جلد ہی ان تینوں نے نقاب پوش کو قابو کرنے کی کوشش کی لیکن نقاب پوش اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگا رہا تھا۔ ان

تینوں کے سامنے اس کے حوصلے جواب دے گئے۔ وہ آہستہ آہستہ مزاحمت ترک کرنے پر مجبور ہونے لگا۔ فضل کریم نے نقاب اُتارنے کی کوشش کی لیکن اس نے نقاب بڑی مضبوطی سے پہنا ہوا تھا۔ فضل کریم ایک بار نقاب اُتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ جونہی چہرہ نظر آیا، اس نے نقاب دوبارہ چڑھا دیا، اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ کیوں کہ نقاب پوش اس کا سوتیلا بھائی محمود کریم تھا جسے اس کے باپ نے اس کی اوباشیوں اور عیاشیوں سے تنگ آ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ وہ گاؤں کے لوگوں سے لڑتا رہتا تھا۔ گاؤں والوں نے کئی بار اس کے باپ سے شکایت کی لیکن وہ اپنی بے ہودہ حرکتوں سے باز نہ آیا۔ اس لیے اس کے باپ نے اسے گھر سے نکال دیا۔ باپ کے مرجانے کے کافی عرصہ بعد گاؤں واپس آیا اور وہ بھی درندے کے روپ میں اس نے گاؤں کی رونقیں اُجاڑ دیں۔ فضل کریم نے کئی بار اس کو ڈھونڈنے کی کوشش کی لیکن اس کا کوئی پتا نہ چلا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے باپ کے مرنے کے بعد وہ اور اس کا بھائی ایک ساتھ رہیں۔ وہ اپنے بھائی کو نیک انسان کے روپ میں دیکھنا چاہتا تھا لیکن قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔

گاؤں کے مشتعل افراد کا ٹولہ بالکل ان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ فضل کریم نے گاؤں کے لوگوں کو رکنے کا اشارہ کیا۔ لوگوں کا یہ ٹولہ بہت غصے میں تھا۔ انہوں نے بغیر کسی حیل و حجت کے نقاب پوش کو اُٹھا کر قریب ہی آگ میں پھینک دیا۔ آگ نے اس کو تیزی سے اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسے پہلے ہی وہ ایسی خوراک کی منتظر تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ فضل کریم حیرت و دکھ کا بت بنے یہ سب دیکھ رہا تھا جب کہ گاؤں والے مجرم کو سزا دینے پر جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے کے گلے مل رہے تھے کیوں کہ انہیں یقین تھا کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کافی دیر کھڑے رہنے کے بعد وہ سب خوشی خوشی اپنے گھروں کو چلے گئے اور آرام کی نیند سو گئے۔ فضل کریم کی آنکھوں سے تو جیسے نیند روٹھ گئی تھی۔ اس نے رات وہیں اپنے بھائی کی راکھ کے قریب بیٹھ کر گزاری۔ آفتاب کے طلوع ہونے پر جب لوگ اپنے اپنے کھیتوں کو دوبارہ کاشت کرنے کی غرض سے پہنچے تو دیکھا کہ نمبردار راکھ کے ڈھیر کے قریب سو رہا تھا۔ جن لوگوں نے یہ منظر دیکھا تو حیران ہو گئے اور اسے جگا کر اس طرح سونے کی وجہ پوچھی۔ فضل کریم نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اپنی توجہ راکھ کے ڈھیر کی طرف رکھی۔ لوگ پریشان تھے کہ آخر فضل کریم کو کیا ہو گیا ہے لیکن کسی کو اس راز کا پتا نہ تھا کہ مرنے والا اس کا سوتیلا بھائی محمود تھا جسے وہ بہت چاہتا تھا لیکن اسے حسد کی آگ نے جلا دیا تھا اور اگر وہ اپنے بھائی کی طرح بننے کی کوشش کرتا تو وہ معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیتا اور اس طرح جل کر نہ مرتا۔

سچ ہے کہ حسد کی آگ ہمیشہ حسد کرنے والے کو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ ☆......☆......☆

کھوج لگائیے میں حصہ لینے والوں کے نام

حسین انصر مان، گوجرانوالہ۔ سید تیمور علی خالد، جھنگ۔ ساجد علی، گوجرانوالہ۔ مہر النساء واحد، لاہور۔ زینب محمود، جہلم۔ سمیعہ توقیر، کراچی۔ محمد احمد رضا انصاری، کوٹ ادو۔ ابرار خان ترین، کوئٹہ۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ لائبہ مریم، رحیم یار خان۔ عائشہ صدیقہ، پشاور۔ محمد اشرف، میانوالی۔ محمد اویس، فیصل آباد۔ زینب خان، پشاور۔ وردہ زہرہ، جھنگ۔ محمد ہاشم، چکسواری۔ عقیلہ رباب منہاس، تلہ گنگ۔ مہوش سرور، کراچی۔ اخلاق احمد، سمندری۔ حسن رضا سردار، کاموکی۔ خدیجہ نشان، کاموکی۔ فاطمہ صغیر، منڈی بہاؤ الدین۔ محمد ابراہیم ہمایوں، حویلیاں۔ مریم رضوان، راول پنڈی۔ سارہ فاطمہ، میانوالی۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ سعدیہ عباس، گوجرانوالہ۔ منصب علی باجوہ، تانیا احسان، حفصہ ارشد، گوجرانوالہ۔ زنیرہ خان، کراچی۔ محمد احمد، ڈیرہ غازی خان۔ حافظ محمد زکوان، بہاول پور۔ محمد قمر الزمان، جوہر آباد۔ سلمان طاہر، محمد عبداللہ ثاقب، پشاور۔ محمد احمد خان غوری، بہاول پور۔ آمنہ اختر، راول پنڈی۔ اسفر علی، بہاول پور۔ محمد اکبر، لاہور۔ محمد شوال ندیم، اوکاڑہ۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ محمد ذیشان، واہ کینٹ۔ محمد رضوان، میانوالی۔ محمد جمال زرگر، میانوالی۔ زوہیب احمد، لاہور۔ فارعہ فہیم، لاہور۔ وجیع ارمغان اصغر، سرائے عالم گیر۔ محمد سلمان، گجرات۔ علینہ احمد، راول پنڈی۔ رافع یونس، لاہور۔ تسنیم عبدالمجید، قصور۔ ہمایوں رشید، اسلام آباد۔ ربیعہ سلیم، فیصل آباد۔ فتح محمد شارق، خوشاب۔ شاہ حاجی، لاہور۔ ردا فاطمہ عمر، راول پنڈی۔ مریم کاشف، حیدر آباد۔ سید اریب احمد، کراچی۔ مصباح اکرم، لاہور۔

''اف! اتنی مہنگائی ہو گئی ہے۔ غضب خدا کا......! آٹے، دال کا بھاؤ تو دیکھو! ان کی قیمتیں تو آسمان کو چھو رہی ہیں۔''

ہماری باجی جان پچھلے ایک گھنٹے سے مہنگائی پر دھواں دھار تقریر کر رہی تھیں جس کا لب لباب یہ تھا۔ آخر ہم نے تنگ آ کر پوچھ ہی لیا۔ ''تو باجی! اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟'' وہ کہنے لگیں۔ ''تم لوگوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔ اسی لیے میں چاہتی ہوں کہ تمھیں بغیر کسی قصور کے سزا نہ ملے۔ دیکھو بچو! ہم سفید پوش لوگ ہیں۔ اپنی ضروریات پوری کر لیں، یہی بہت ہے۔ مستقبل کو نظرانداز کرنا ہمارے لیے بہت مشکل ہے۔ اسی لیے تم لوگ پیسے جمع کرنا شروع کر دو تاکہ تمھیں اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے ماں باپ کے پاس نہ جانا پڑے۔ ہم ان کے بچے ہیں، ہمیں ان کا خیال کرنا چاہیے۔'' باجی کہہ تو ٹھیک رہی تھیں۔ میرے لیے تو پیسے جمع کرنا مشکل نہ تھا مگر میرے چھوٹے بھیا جی کے چہرے پر بہت سے رنگ آ اور جا رہے تھے۔ بھیا جی کے لیے یہ کام انتہائی مشکل تھا کیوں کہ وہ تو منٹوں میں تمام پیسے اُڑا دیا کرتے تھے۔ اِدھر دوست نے کوئی نیا کھلونا دکھایا، اُدھر بھیا جی نے وہ خرید لیا۔ پہلے دن ہی تمام پیسے اُڑا دینے کے باوجود بھی ان کا دل نہ بھرتا تھا۔ وہ مزید پیسوں کا مطالبہ کرنے لگتے، یوں مہینے میں ہزاروں پیسے وہ اُڑا لیتے۔ ان کی عادات دیکھ کر ابا، امی اور باجی کو تشویش ہوئی۔ اسی لیے ہمیں اتنے سخت آرڈر ملے تھے تاکہ ہم دونوں بھائیوں کو بچت کرنے کی عادت پڑ جائے۔ بھیا جی چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے انھیں تھام لیا۔ باجی یہ حکم بھی صادر کر کے گئی تھیں کہ ہر مہینے کی جمع کی ہوئی رقم وہ خود دیکھیں گی، جو زیادہ جمع کرے گا، اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہو گا۔ ساتھ ہی لالچ دے کر ہمیں مجبور کر گئیں۔ ہم نے خوب جمع کیا، اب وقت آ گیا تھا کہ ہم ایک لیپ ٹاپ خرید سکتے تھے۔ میں نے بھیا جی سے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو وہ بولے۔ ''بھائی جان! مہینہ ختم ہونے دیں، پھر جتنے پیسے جمع ہوں گے میں آپ کو دے دوں گا اور ہم لیپ ٹاپ لے لیں گے۔'' اس کی بات ٹھیک تھی، مجھے مہینہ ختم ہونے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ آخری دن میں نے اس سے پیسے مانگے تو وہ خالی ہاتھ لوٹا۔ میں نے پوچھا۔ ''پیسے کہاں ہیں؟'' بمشکل اس کے گلے سے آواز نکلی۔ ''جہاں میں رکھتا ہوں، وہاں نہیں ہیں!'' یہ سن کر میرے تو حواس باختہ ہو گئے۔ پیسے گم ہو جانے سے زیادہ مجھے غم اس بات کا تھا کہ اب باجی کو کیا جواب دیں گے۔ خیر جو ہونا تھا سو ہو گیا مگر صبر کرنا تو

ہم نے سیکھا ہی نہ تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہرصورت چور کا سراغ لگا کر چھوڑیں گے۔ اگلے روز ہم اسکول سے رخصت لے کر آ گئے۔ شومئی قسمت امی گھر پر نہیں تھیں۔ ابا آفس اور باجی کالج گئی ہوئی تھیں۔ گھر میں ماسی کام کر رہی تھی۔ ہم انھیں مشکوک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ ہم نے پورے گھر کی تلاشی لی اور اب ہمارا رُخ ماسی کی طرف تھا۔ ہم نے ماسی پر اپنا غصہ ٹھنڈا کیا اور ان پر چوری کا الزام بھی لگا دیا۔ وہ اپنی صفائیاں دیتی رہیں مگر ہم ان کی ایمان داریاں اور احسانات بھول گئے۔ وہ روتی ہوئی گھر سے نکل گئیں اور ہم ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

ایک گھنٹے بعد امی جان آ گئیں۔ پوچھنے لگیں۔ ''بچو! ماسی کو کہیں دیکھا ہے؟'' ہم نے نفی میں سر ہلا دیا تو کہنے لگیں۔ ''حیرت ہے، صبح آئی تھی اب گھر میں نہیں۔ اوّل تو وہ اتنی جلدی جاتی نہیں اور اس کے علاوہ کہیں اور بھی نہیں جاتیں۔'' ہم معنی خیز انداز میں مسکراتے رہے۔ رات کو کھانے پر جان بوجھ کر ماسی کی بات چھیڑ دی۔ امی کو ماسی پر غصہ تھا کہ ایک تو کام اُدھورا چھوڑ گئی، اور پھر واپس بھی نہیں آئی۔ دو دن گزر گئے، پھر چار دن اور اب مہینہ ہونے کو تھا مگر ماسی کو نہ آنا تھا، نہ آئی۔ سب حقیقت سے بے خبر تھے۔ امی، ماسی سے بدظن ہو چکی تھیں اور اب ایک نئی ماسی کام کے لیے آنے لگی تھی۔ یہ ایک ہفتہ پہلے کی بات ہے۔ اتوار کا دن تھا، پورا گھر صاف ہو رہا تھا۔ ہمارے کمرے کی بے ہنگم صورتِ حال دیکھ کر امی جان نے پورے کمرے سے فالتو اشیاء نکالنے کا حکم دے دیا۔ ہم دونوں نے مل کر کمرے کی صفائی شروع کر دی۔ الماری کی صفائی کرتے ہوئے مجھے ایک خوب صورت بھالو، چار ریموٹ کنٹرولڈ گاڑیاں اور ایک جہاز ملا۔ یہ سب چیزیں دو مختلف ڈبوں میں بڑے ہی خوب صورت انداز میں سجی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی رازداری سے بھیا سے سب کچھ اگلوا لیا۔ یہ سب کچھ بھیا کا ہی کیا دھرا تھا۔ آپ نے وہ ضرب المثل تو سن رکھی ہو گی کہ ''چور چوری سے جائے، ہیرا پھیری سے نہ جائے۔'' اس میں کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ بھیا جی نے اتنے پیسے ایک ساتھ دیکھے نہ تھے اور اپنے جمع شدہ پیسوں سے یہ چیزیں خرید لائے تھے مگر حقیقت یہ بھی تھی کہ وہ اس بھالو اور گاڑیوں کو مجھ سے چھپا کر رکھتے ہوئے خود بھی اس کے متعلق بھول گئے تھے۔ پیسوں کے متعلق ان کی پریشانی حقیقت تھی۔ اس بار تو حیرت انگیز طور پر باجی نے بھی ہماری جمع پونجی نہیں دیکھی تھی۔ خیر ''جان بچی سو لاکھوں پائے'' بھیا جی اپنے کھلونے پا کر خوشی سے نہال تھے۔

رات کو اپنے کمرے کی کھڑکی سے چاند کو تکتے ہوئے مجھے اچانک ہی اس ماسی کا خیال آیا۔ صبح ہی صبح ہم دونوں اپنی غلطی کا ازالہ کرنے ان کے گھر پہنچ گئے۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ چوکھٹ بند کرنے لگی مگر ہم نے انھیں روکا اور ایک بار استدعا کی کہ ہماری بات سن لی جائے۔ وہ نیک عورت تھیں، انھوں نے ہمیں بلا لیا اور ہم نے تمام احوال ان کے گوش گزار کر دیئے اور معافی بھی مانگی۔ پھر ان سے ایک سوال بھی کیا جو ہمیں بے چین کر رہا تھا۔ ''ماسی! اگر آپ نے چوری نہیں کی تھی تو پھر آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس وقت آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ یوں نوکری چھوڑنے سے آپ مزید مشکوک ہو جائیں گی۔'' وہ بولیں۔ ''بیٹا! میں نے آپ سب کی نظروں میں ایک معتبر مقام قائم کیا ہوا تھا مگر جب وہ اعتبار ہی ٹوٹ گیا تھا تو میں کب تک آپ کی مشکوک نگاہوں کا سامنا کرتی؟ کب تک اپنی بے گناہی کا ثبوت پیش کرتی رہتی؟ کیا یہ میری ایمان داری کی تذلیل نہ ہوتی؟'' وہ ہمیں لاجواب کر گئیں مگر پھر بھی اس باظرف عورت نے ہمیں معاف کر دیا۔ ہم ان کو بڑی مشکل سے منا کر گھر لائے۔ باجی اور امی کو ساری بات بتائی اور ان سے استدعا کی کہ ابو کو نہ بتایا جائے ورنہ ہماری خیر نہیں۔ اس پارسا عورت پر اب ہمارا اعتبار مزید مضبوط ہو گیا تھا اور اس عظیم عورت نے مرتے دم تک اس اعتبار کو قائم رکھا۔ آج میں اس کی قبر کے سرہانے بیٹھ کر یہ کہانی لکھ رہا ہوں اور بہت شرمندہ بھی ہوں۔ بغیر ثبوت اور تحقیق کے کسی پر الزام تراشی سے گریز کرنا چاہیے کیوں کہ الزام چاہے کتنا بھی چھوٹا کیوں نہ ہو، ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ بہت سی زندگیاں برباد کر دیتا ہے اور دوسروں کے اعتبار کو بھی ٹھیس پہنچاتا ہے۔

☆☆☆

معلوماتِ عامہ

- آسمانی بجلی کی ایک چمک میں اوسطاً 5 کروڑ ہارس پاور قوت چھپی ہوتی ہے۔
- شمالی اور جنوبی قطبین میں چھ مہینے کی لمبی رات ہوتی ہے۔
- انسانی جسم میں خون 75 میل فی گھنٹا کی رفتار سے گردش کرتا ہے۔
- جھاواں ایک ایسا پتھر ہے جو کہ پانی میں نہیں ڈوبتا ہے۔
- سورج کا وزن زمین سے 3 لاکھ 32 ہزار گنا زیادہ ہے۔
- سورج کی روشنی 8 منٹ اور چاند کی روشنی ڈیڑھ سیکنڈ میں زمین پر پہنچتی ہے۔
- مسلمان سائنس دان ابن الہیثم نے سب سے پہلے فوٹوگرافی کا اصول بتایا تھا۔
- شیش محل مغل بادشاہ شاہ جہان نے تعمیر کروایا تھا۔
- ماؤنٹ ہیرون وہ پرندہ ہے جو اپنے پر پھیلا کر گانا گاتا ہے۔
- ہاتھی کے دماغ کا وزن 11 پونڈ ہوتا ہے۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ مسجدیں ترکی میں ہیں۔
- دُنیا میں کل 296 زبانیں بولی جاتی ہیں۔
- دُنیا کا سب سے چھوٹا ہیلی کاپٹر جاپان نے بنایا۔
- اٹاکاما (Atacama) چلی کا وہ ریگستان ہے جہاں آج تک بارش نہیں ہوئی۔
- دُنیا میں سب سے زیادہ بکنے والی چیز سگریٹ ہے۔
- ڈنمارک ایک ایسا ملک ہے جہاں پر ہر مرد اور عورت پڑھی لکھی ہے۔
- سب سے پہلا جنگی جہاز حضرت معاویہؓ نے بنایا تھا۔
- مسلمانوں پر روزہ 2 ہجری (شب معراج) کو فرض ہوا۔
- انسانی آنکھ کی پتلی کا وزن 1 اونس کے برابر ہوتا ہے۔
- پھولوں کا ملک ہالینڈ کو کہتے ہیں۔
- سورج پر سب سے زیادہ ہائیڈروجن گیس پائی جاتی ہے۔
- ایران کا قومی پھل انار ہے۔

- دُنیا کا سب سے بوڑھا درخت کیلی فورنیا میں ہے اور اس کی عمر 500 سال ہے۔

(محمد حبیب صابر، توصیف رضا، پیرمحل)

- سب سے پہلے چاند کا نقشہ تھامس ہیرٹ نے تیار کیا۔
- لاطینی زبان کو مردہ زبان کہا جاتا ہے۔
- قبرص میں کسی ایک ترانے پر وہاں کے لوگوں کا اتفاق نہیں ہے۔
- سکندرِ اعظم پہلا فوجی کمانڈر تھا جس نے اپنی فوج میں داڑھی منڈوانا لازمی قرار دیا تھا۔
- گلاب کا عطر جہانگیر کی ملکہ نور جہاں نے ایجاد کیا۔
- پاکستان میں پہلا عجائب گھر کراچی میں تعمیر ہوا۔
- بنی نوع انسان نے سب سے پہلے جَو کی کاشت کی۔
- انگریز مسلمانوں کو خان بہادر کا اور ہندوؤں کو رائے بہادر کا خطاب دیتے تھے۔
- فنِ تعمیر کے لحاظ سے دُنیا کا مکمل ترین مینار، قطب مینار ہے۔
- قرآن مجید میں تین سورتیں بددعا سے شروع ہوتی ہیں۔
- حضرت امام حسینؓ نے اپنی زندگی میں پینتیس (35) پیدل حج کیے۔

(حافظ محمد فرخ حیات، پیرمحل)

- ہوا کا وزن ناپنے کے لیے "ایرومیٹر" استعمال ہوتا ہے۔
- دودھ کے لیے "لیکٹومیٹر" استعمال ہوتا ہے۔
- چھوٹی چیزوں کو دیکھنے کے لیے "مائیکرواسکوپ" استعمال ہوتا ہے۔
- بلڈ پریشر ناپنے کے لیے "کیموگراف" استعمال ہوتا ہے۔
- زلزلے کی طاقت ناپنے کے لیے "سیموگراف" استعمال ہوتا ہے۔
- آگ کا درجہ حرارت ناپنے کے لیے "پائرومیٹر" استعمال ہوتا ہے۔
- بارش کی مقدار معلوم کرنے کے لیے "رین گیج" استعمال ہوتا ہے۔
- دھڑکن معلوم کرنے کے لیے "کارڈیوگراف" استعمال ہوتا ہے۔
- دل کی ECG کرنے کے لیے "الیکٹروکارڈیوگراف" استعمال ہوتا ہے۔

(سیدہ انسارہ، ضلع وہاڑی)

''امی میری کتابیں کہاں گئیں؟ ابھی پڑھتے پڑھتے اُٹھا تھا اور اب واپس آیا ہوں تو کتابیں غائب ہیں۔'' ابراہیم نے امی کو آواز دی۔

''بیٹا! یہ آپ کی ذرا سی دیر صرف دو گھنٹے کی تھی۔ آپ کی کتابیں آپ کی میز پر رکھی ہیں۔ بھلا پورے بیڈ پر پھیل کر یہ کتابیں خود ہی پڑھائی کر رہی تھیں؟'' امی نے جواب دیا۔

''میں اور اسماعیل وہاں لاؤنج میں لڈو کھیل رہے تھے۔ آپ نے وہ بھی سمیٹ دی۔ کیرم بورڈ کو تو آپ پھینک ہی دیں۔ جہاں ہم کھیلنے بیٹھیں آپ کو سمیٹنے کی فکر لگ جاتی ہے۔'' ابراہیم پھر غصے سے بولا۔

''ہاں بھئی ہاں...... کھیلو ضرور کھیلو مگر یہ کیا کہ ہر چیز پورا پورا دن کمرے یا لاؤنج یا صحن میں بکھری پڑی رہے۔ گھر کو گھر ہی رہنے دو، کباڑ خانہ نہ بناؤ۔ کہیں کتابیں تو کہیں لڈو کیرم، کہیں کمپیوٹر تو کہیں موبائل ہمراہ کانوں کی ٹوٹیوں کے پڑا ہے۔'' امی نے بھی خوب تیزی سے جواب دیا۔

''بیگم، ان کانوں کی ٹوٹیوں کو ہیڈ فون کہتے ہیں۔'' ماں بیٹے کی لڑائی میں ابا بھی شریک ہوئے۔ ''ان کی وجہ سے گھر میں شور شرابا نہیں ہوتا۔ ہم تینوں معصوم اپنے اپنے کانوں میں لگا کر آپ کو اطمینان اور گھر کو سکون فراہم کرتے ہیں۔''

''ہاں بھئی، آپ تینوں ہی تو میرے سب سے بڑے خیر خواہ ہیں۔ پہلے یہ اخبار کیا کم تھا آپ کے لیے۔ سارا دن آنکھوں سے لگائے دُنیا جہاں سے بے خبر رہتے تھے اور اب کانوں میں ان ہیڈ فونز نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔ لاکھ آوازیں دوں...... کوئی کام کہوں، بیٹے اور ان کے والدِ محترم سنتے ہی نہیں۔ دیکھنا کسی دن ان کی وجہ سے کوئی نہ کوئی نقصان ہو جائے گا۔'' امی کو ان معصوم ہیڈ فونز پر بے حد غصہ تھا۔ سارا دن آوازیں دینے پر بھی تمام افرادِ خانہ جواب نہ دیتے۔ کسی بھی چیز کو استعمال کے بعد سمیٹنا ان کی لغت میں نہیں تھا۔

''ابراہیم اور اسماعیل سنو دونوں...... کان کھول کر! مطلب ٹوٹیاں نکال کر۔'' اب امی غرائیں۔ ''اگر تم سب ہر چیز کو استعمال کرنے کے بعد پھیلاتے رہو گے تو آئندہ کام سے پہلے اسے ڈھونڈنے میں کتنا وقت ضائع ہو گا......؟ کام سے پہلے ہی کوفت ہونے لگے گی۔ ان بکھری ہوئی اشیاء سے گھر، کباڑ خانے کی شکل اختیار کر جائے گا۔''

''امی! اب یہ بستر روز ہی سونے کے لیے استعمال ہونا ہے۔ بھلا روز اسے اُٹھانے، ٹھیک کرنے کی کیا ضرورت...... وقت کا

زیاں ہی ہے ناں!'' ابراہیم جو نیا نیا کالج جانا شروع ہوا تھا، نکتہ نکال لایا اور اس پر ابا جان بے اختیار جھوم اُٹھے۔

''امی! جب روز ایک ہی یونی فارم پہن کر اسکول جانا ہے تو روز بدلنا، مقررہ مقام پر لٹکانا، سب کیوں ضروری ہے......'' دوسرا نکتہ اسماعیل نے نکالا جو میٹرک کے طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بلا کے سست اور کاہل تھے۔

''امی! یہ لیپ ٹاپ، موبائل، ہیڈ فون، یہ تاریں سب تو ہماری زندگی کی طرح ہے۔ بھلا انہیں سمیٹنے کی کیا ضرورت...... بس جہاں جو چیز رکھی ہو، وہیں رکھی رہنے دیا کریں۔ ہمارا وقت ان اشیاء کو ڈھونڈنے میں ضائع ہوتا ہے۔'' سامنے بکھری ہوئی چیزوں سے خفگی بھری نگاہ ڈال کر اپنے شوہر نامدار کی طرف متوجہ ہوئیں جو آنکھوں ہی آنکھوں میں بیٹوں کو داد دے رہے تھے اور اپنی مسکراہٹ چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔

یہ ایک متوسط گھرانہ تھا۔ محمد علی صاحب ایک مقامی کالج اور اکیڈمیز میں پڑھانے کے بعد گھر آ کر موڈ بس آرام، آرام اور آرام کا ہوتا۔ ابراہیم اور اسماعیل ان کے دونوں صاحبزادے ایف ایس سی اور میٹرک کے طالب علم تھے۔ دورانِ پڑھائی اپنے موبائل پر ہیڈ فون لگا کر گانے سننا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ کالج، اسکول اور اکیڈمی سے ٹیوشن کے بعد دونوں اپنے اپنے لیپ ٹاپ پر مصروف ہو جاتے۔ گیمز بھی بستر پر بیٹھ کر کھیلی جاتی اور کارٹون یا فلمیں بھی وہیں بیٹھ کر دیکھ لی جاتیں۔ ان ہمہ وقتی سکرینوں اور مار دھاڑ سے بھرپور گیمز نے لڑکوں کو خاصا شدت پسند بنا دیا تھا۔ دورِ جدید کے ان لوگوں کے درمیان آمنہ بیگم خاصی سلیقہ شعار اور وقت کی پابند خاتون تھیں۔ ہمہ وقت بچوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے کام خود کرنے کی تلقین بھی کرتیں اور ہر وقت کی بے ترتیبی پر سب کو ڈانٹتیں بھی۔

امی جان کے لیے ملتان سے آنے والی اطلاع خاصی پریشان کن تھی۔ شام کو سب افرادِ خانہ بیٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ آمنہ بیگم کی امی کی اچانک بیماری کی اطلاع موصول ہوئی۔ پروفیسر صاحب نے بیگم کو فوراً روانہ ہونے کا مشورہ دیا۔ دونوں بیٹوں نے جلدی جلدی امی کے ساتھ مل کر تیاری کرائی اور رات ہی انہیں ملتان کے لیے روانہ کر دیا۔ آمنہ بیگم اپنی والدہ کی طرف سے بھی فکر مند تھیں اور گھر پر شوہر اور بچوں کے لیے بھی۔ بچوں کے لیے ڈھیروں دعائیں مانگ کر وہ روانہ ہو گئیں۔

اگلا دن خاصی دیر سے طلوع ہوا۔ امی کی غیر موجودگی کی وجہ سے کوئی بھی صبح وقت پر نہ اُٹھ سکا۔ پروفیسر صاحب کی آنکھ گیارہ بجے کھلی۔ کیا چمک دار صبح تھی۔ وہ خوش گوار موڈ میں لاؤنج میں آئے، سامنے گھڑی گیارہ بجا رہی تھی۔ خاصی دیر ہو چکی تھی۔ جلدی جلدی لڑکوں کو جگا کر ناشتے کی تیاری کر لی گئی اور بارہ بجے تینوں اپنے اپنے کاموں پر روانہ ہو گئے۔ شام کو گھر واپسی پر ابا جان دو بڑے پیزے لیتے ہوئے آئے۔ تینوں نے پیزا کھایا۔ پھر اپنے اپنے بستر اور اپنا اپنا کمپیوٹر...... اپنے اپنے ہیڈ فونز۔ دوسرا دن بھی دیر سے شروع ہوا۔ آج ہر کام کرنے میں دیر ہو رہی تھی۔ سب نے اپنے اپنے کپڑے ڈریسنگ روم کے فرش پر گولے بنا کر ڈال دیے تھے۔ اپنے اپنے کپڑوں کی شناخت خاصی مشکل تھی۔ ابراہیم کی شرٹ میں کوئی کیڑا گھس گیا تھا جس نے ذرا سی دیر میں اسے کئی جگہ سے کاٹ لیا۔ الٹا سیدھا ناشتہ کر کے سب روانہ ہوئے، مگر خاصی دیر ہو چکی تھی۔

آج واپسی پر برگر کا آرڈر دیا گیا۔ پروفیسر صاحب اپنے لیے سالن روٹی لے آئے تھے۔ گھر میں ہر طرف چیزیں بکھری تھیں۔ بستر، جوتے، کپڑے، کتابیں، کمپیوٹر، برتن...... آج تو پروفیسر صاحب کو بھی اپنا نائٹ سوٹ ڈھونڈنے میں وقت لگا۔ کچن میں صاف برتنوں کی قلت ہوتی جا رہی تھی۔ الماریوں میں لگے مہمانوں کے لیے رکھے گئے برتن نکالنا شروع کر دیے تھے۔ ڈسٹ بن دو ہی دنوں میں بھر کر بدبو دینے لگا تھا۔ پانی کی بوتلیں خالی پڑی تھیں، بھرنے کو کوئی راضی نہ تھا۔ تیسرے روز سب جلدی اُٹھ گئے۔ ناشتہ بھی جلدی کر لیا مگر اسماعیل کے جوتے ایسے غائب ہوئے کہ گھر کا کونا کونا چھان مارا، ناچار چپل پہن کر اکیڈمی جانا پڑا۔ دوسری طرف ابراہیم صاحب کا بستہ کھو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب اپنا موبائل ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ سب ہی تلاشِ گمشدہ میں مصروف تھے اور گھڑی کی سوئیاں ان کے لیٹ ہو جانے سے بے خبر تیزی سے دوڑ رہی تھیں۔ آخر باہر نکلتے ہی یاد آیا کہ گاڑی کی چابی بھی گم ہے۔

اب اس تلاش میں سب کا وقت نکل چکا تھا۔ گھڑی تین بجا چکی تھی، مفت میں چھٹی۔

آج شوارمے منگوائے گئے۔ ابا جان فون پر امی جان سے کھچڑی کی ترکیب پوچھنے لگے۔ فون پر ترکیب تو سمجھائی جا سکتی تھی مگر چیزیں ڈھونڈ کر دینا ممکن نہ تھا۔ سو آج ابا جان نے سادہ دہی سے تندور کی روٹی کھائی۔

اگلا دن پھر چھٹی کا دن ثابت ہوا۔ لڑکوں کا پیٹ شدید طریقے سے خراب ہو چکا تھا۔ آج نہ سارا دن پڑھائی ہو سکی نہ کھیل، بس سارا دن امی کی زیرِ ہدایت او آر ایس بنا کر پیا گیا اور کیلے کھائے گئے۔

''امی جان، آپ آ جائیں۔'' آج نانی کی طبیعت بہتر ہونے کی اطلاع ملتے ہی پہلی فرمائش اسماعیل نے کی۔ ''امی، ہم آپ کو لینے خود آ جاتے ہیں۔'' ابراہیم کی اُداسی اور بھی زیادہ تھی۔ ''امی سے کہو تیار رہیں، کل ہم سویرے سویرے لاہور سے ملتان کے لیے روانہ ہوں گے۔'' کچن میں گلاس دھوتے ابا جان وہیں سے بولے۔

''ابو! امی کو تو اپنا گھر اس حال میں دیکھ کر یقیناً بہت صدمہ ہو گا۔'' دونوں بیٹے بولے۔ ''چلو میاں! یہ وقت بھی آنا تھا، مل کر کام کرتے ہیں۔ پہلے کچن، پھر گھر کی صفائی اور آخر میں کپڑے سمیٹ لیں گے۔'' تینوں کی محنت رنگ لائی اور شام تک گھر کی شکل کسی حد تک نکل آئی۔ دورانِ صفائی بہت سی اشیاء نہایت غیر متوقع جگہ سے برآمد ہوئیں۔ اسماعیل کے جوتے کپڑوں کے ڈھیر کے نیچے سے ملے۔ ابا جان کی عینک بستر کی چادر ٹھیک کرتے ہوئے برآمد ہوئی۔ اسماعیل کے ہیڈ فونز باتھ روم کے شیشہ پر رکھے تھے اور چارجر کچن میں۔ آج انہیں ادراک ہوا تھا کہ بھلا کانوں میں ٹوٹیاں لگا کر اور نگاہیں مصنوعی میدانِ جنگ پر گاڑ کر زندگی کے امتحان کیسے دیے جا سکتے ہیں۔ وقت کو تو سوٹ کیس میں سامان کی طرح پیک کرنا پڑتا ہے۔ ہر چیز کو اس کی مقررہ جگہ پر مقررہ اوقات میں رکھنا بے شمار مشکلات سے بچا لیتا ہے۔

صبح سویرے سفر کا آغاز خاصے خوشگوار موڈ سے ہوا تھا۔ ابا جان گاڑی چلا رہے تھے۔ ابراہیم ساتھ سیٹ پر بیٹھا اپنے موبائل پر گانے سن رہا تھا۔ اسماعیل بھی کانوں میں ہیڈ فونز لگائے جھوم رہا تھا۔ خاصے طویل عرصے بعد وہ سب کسی لمبے سفر کے لیے نکلے تھے اور ساتھ ہی ساتھ امی جان کی واپسی کے خیال سے سب کی خوشی بھی بڑھ گئی تھی۔

''ابو! اس مرتبہ میرے کالج کے اُردو کے ٹیچر نے میرے ساتھ زیادتی کی ہے۔'' ابراہیم کو اپنا اُردو کا رزلٹ یاد آ گیا۔

''کیوں بیٹے، کیسے......؟'' ابا جان بھی حیران ہوئے۔

''ٹیچر نے اُردو کے پیپر میں مضمون کا موضوع شعر کے مصرعے کی شکل میں دیا تھا۔ میں نے موضوع چنا۔

کھول آنکھ زمین دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس شعر میں شاعر صبح خیزی کے فائدے بتا رہا ہے۔ صاف صاف پتا چل رہا ہے۔ میں نے ورزش کے فائدے بھی ساتھ لکھے۔ سیر کے فائدے بھی، مگر ٹیچر نے مضمون کے صفر نمبر دیے۔'' ابراہیم نے شکایت لگائی۔ ''وجہ پوچھی تو ٹیچر نے اس قدر غصے سے

مجھے گھورا کہ میں آگے بول ہی نہ سکا۔"

"بیٹا! نیچر نے ساتھ میں دو ڈنڈے نہیں لگائے......؟" ابا جان نے پوچھا تو ابراہیم بھی شرمندہ ہوگیا۔ "بیٹا! اگر آپ بھی کبھی مطالعہ کر لیا کریں، اور کچھ نہیں اخبار ہی پڑھ لیا کریں تو ایسی شرم ناک غلطیاں نہیں ہوں گی۔ دل چاہ رہا ہے کہ یہیں گاڑی روک کر تمہاری خبر لوں۔ آئندہ روز شام کو ایک گھنٹا اُردو میں خود پڑھاؤں گا۔ اسماعیل کی تو املاء اس قدر خراب ہے کہ مضمون پڑھ کر پہیلیوں کا سا گمان ہوتا ہے۔" ابا جان کا غصہ دیکھ کر ابراہیم کو اپنی سابقہ مصروفیت بہتر لگی۔ دوبارہ موبائل سے گانے سننے لگا اور پروفیسر صاحب اپنی توجہ ڈرائیونگ پر دینے لگے۔

ملتان سے سوکلومیٹر پہلے تینوں کو فریش ہونے کا خیال آیا۔ ایک صاف ستھرے پٹرول پمپ پر گاڑی روکی۔ لڑکے منہ ہاتھ دھو کر تازہ دم ہو چکے تھے۔ گرم گرم چائے نے ان کی تھکن بھی اُتار دی تھی۔

"ابو! اب گاڑی میں چلاؤں گا۔" ابراہیم نے اجازت نہیں لی بلکہ اطلاع دی۔ "اچھا یار! تم دونوں آگے بیٹھو، میں پیچھے بیٹھوں گا مگر صرف پندرہ منٹ۔ پھر تم دونوں نے اچھے بچوں کی طرح سے گاڑی میں بیٹھنا ہے۔" ابا جان راضی ہو گئے۔ لڑکے خوشی میں جھومتے گاڑی کی اگلی سیٹوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ پروفیسر صاحب جب پیچھے بیٹھے تو انہیں یاد آیا کہ وہ عینک بھول آئے ہیں۔ موبائل سیٹ پر پھینکتے ہوئے وہ واپس پلٹ گئے۔ دونوں بیٹے دروازہ کھلنے اور پھر بند ہونے کی آواز سن کر ابا جان کے بیٹھنے کا اندازہ لگا بیٹھے۔ سو کانوں میں اپنی اپنی ٹوٹیاں لگائے، ابراہیم نے گاڑی بڑھا دی۔ پیچھے دیکھنے کی دونوں بھائیوں نے زحمت ہی نہ کی۔

پروفیسر صاحب عینک لے کر واپس آئے تو نہ بیٹے، نہ گاڑی۔ کچھ دیر تو ہونق سے کھڑے رہے۔ پٹرول پمپ کے ملازم نے بتایا کہ دونوں بچے گاڑی لے جا چکے ہیں۔ اب موبائل بھی گاڑی میں اور بیٹوں کے فون نمبر یاد رکھنا بھی نئے وقت کی ضرورت نہ رہی تھی۔ جیب میں ہاتھ ڈالا تو یاد آیا کہ بٹوہ بھی گاڑی میں ہی تھا۔ اب عجب صورت حال تھی۔

پٹرول پمپ ہی سے واحد یاد شدہ نمبر بیگم کو کال کر کے بیٹوں کی حرکت کے بارے میں بتایا اور فوراً انہیں کال کرنے کی ہدایت کی۔

امی جان نے ابراہیم کے فون پر کال کی۔ موصوف نے اپنے میوزک میں کالنگ امی دیکھ کر کال ریسیو کر لی۔

"ابراہیم تم ابو کو پیچھے چھوڑ آئے ہو؟" امی نے جلدی سے بیٹے کو اطلاع دی۔ "امی، وہ ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھے ہیں۔" ابراہیم نے امی کو جواب دیا۔ ساتھ ہی گاڑی سائیڈ پر روک کر پیچھے گھوم کر دیکھا۔

"نہیں، وہ پٹرول پمپ پہ رہ گئے ہیں۔ گاڑی واپس موڑو......!!" امی سختی سے بولیں۔ اب اسماعیل نے بھی کانوں سے ہیڈ فون اور آنکھوں سے کالا چشمہ اُتار کر پیچھے دیکھا۔

"بس امی، ابھی جاتے ہیں۔" گاڑی واپس موڑ کر دونوں پمپ پر پہنچے۔ ابا جان سامنے پریشان کھڑے تھے اور بیٹے شرمندگی میں ڈوبے تھے۔ نئی ایجادات سے فائدہ اُٹھانے کے نشے میں ہوش وحواس کھو دینے کا یہ عملی تجربہ انہیں بہت سے سبق دے گیا تھا۔

پروفیسر صاحب نے دونوں کو گھورا، ڈانٹا اور پھر کان کھینچے۔ پھر تینوں امی جان کو لینے روانہ ہو گئے۔ ☆☆

ٹماٹر ایک مفید سبزی ہے

ٹماٹر کا شمار ان سبزیوں میں ہوتا ہے جو پوری دنیا میں اہمیت کا حامل ہے۔ ٹماٹر کا ابتدائی وطن جنوبی امریکہ میں واقع ایکویڈور اور پیرو ہے۔ ٹماٹر ایک مفید غذا ہے۔ اس کو بغیر پکائے بھی کھایا جا سکتا ہے۔ چوں کہ اس کا رنگ لال ہوتا ہے لہٰذا اسے لال بینگن بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں حیاتین الف، ب اور ج کثیر مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ اس میں تین طرح کی ترشیاں (Acids) پائے جاتے ہیں۔ ٹماٹر کمزوری، سستی کو دور کرتا ہے۔ قوت ہاضمہ اور پھیپھڑوں کی بیماریوں میں مفید ہے۔ یہ جراثیم کش ہے ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط کرتا ہے۔ جسم میں وٹامن C کی کمی ہو جائے تو سوجن ہو جاتی ہے۔ جسم کے جوڑ کمزور پڑ جاتے ہیں۔ جسم نہیں بڑھتا۔ آدمی پست رہ جاتا ہے۔ دانت اور مسوڑھے کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان بیماریوں میں ٹماٹر بہت مفید ہے۔ جگر کے فعل کو درست کرتا ہے۔ جن بچوں کو بوتل کا دودھ پلایا جاتا ہے، انہیں ایک اونس ٹماٹر کا جوس پلانا چاہیے۔ اگر صبح نہار منہ ایک کچا ٹماٹر کھا لیا جائے تو بدن میں طاقت آتی ہے۔ قبض دور ہو جاتی ہے اور ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ تاہم متواتر کھانے سے گلے اور مسوڑھوں کو پھلا دیتا ہے۔ ☆☆

آپ بھی لکھیے

باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب

(تسمیہ ادریس کھتری، کراچی)

''منصور پڑھائی کا وقت ہے، نیچے آجاؤ۔'' یہ منصور کی امی کی آواز تھی جو منصور کو پڑھنے کے لیے نیچے بلا رہی تھیں لیکن منصور نے امی کی بات سنی اَن سنی کر دی۔

منصور بہت شرارتی تھا۔ اسے کھیل کود کا اور پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا اور اس شوق کی وجہ سے وہ اپنے ماں باپ کا کہنا بھی نہیں مانتا تھا۔ منصور کا ایک بھائی تھا ہادی۔ ہادی بہت نیک اور فرماں بردار تھا۔ یہ دونوں بھائی چھٹی جماعت کے طالب علم تھے۔

منصور کی امی اسے بہت سمجھاتی تھیں کہ بیٹا! دل لگا کر پڑھو، بڑوں کا ادب کرو تاکہ تم ایک اچھے انسان بن سکو اور کام یاب زندگی گزار سکو لیکن منظور ہمیشہ کی طرح امی کی باتوں کو ٹال دیا کرتا، جب کہ ہادی دل لگا کر پڑھتا اور اپنے امی ابو کی ہر بات مانتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ دونوں بھائی دسویں جماعت میں آ گئے۔ منصور اب بھی اپنے امی ابو کا کہنا نہیں مانتا اور وقت ضائع کرتا۔ بہرحال میٹرک کا امتحان بھی اس نے دے دیا۔ جب دونوں کا میٹرک کا نتیجہ آیا تو ہادی نے شان دار نمبروں سے امتحان پاس کیا جب کہ منصور بڑی مشکلوں سے پاس ہوا۔

پانچ سال گزر گئے۔ ہادی ہر امتحان میں کام یاب اور منصور ناکام ہوتا رہا۔ اب ہادی انجینئر بن چکا تھا اور اس کی اعلیٰ نوکری بھی لگ گئی تھی۔ منصور فالتو کاموں میں اپنا وقت برباد کرتا رہا۔ اپنے بھائی کو کام یاب دیکھ کر اسے یہ خیال آیا کہ وہ انجینئر کیوں نہیں بن سکا؟ اسے اپنا ماضی یاد آنے لگا۔ اپنے ماں باپ کی نصیحتیں یاد آنے لگیں۔ اسے یہ احساس ہو گیا کہ اس نے اپنے ماں باپ کی بہت نافرمانی کی ہے، جس کی وجہ سے وہ ترقی نہیں کر سکا۔ اگر وہ اپنے ماں باپ کا کہنا مان لیتا اور پڑھ لیتا تو آج وہ بھی ایک کام یاب انسان ہوتا۔

اسی وقت منصور نے اپنے ماں باپ سے معافی مانگی اور آئندہ کبھی بھی نافرمانی نہ کرنے اور ماں باپ کی رضا پر راضی ہونے کا وعدہ کیا..... اسے یہ بات سمجھ آ گئی تھی کہ جو باادب ہوتے ہیں، وہ بانصیب بھی ہوتے ہیں اور جو بے ادب ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ نقصان میں رہتے ہیں اور بے نصیب ہوتے ہیں۔

(پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)

صحیح فیصلہ

(محمد شمیم عالم، اوکاڑہ)

''مجھے نہیں پتا مجھے ویڈیو گیمز اور کھلونے چاہئیں، ورنہ میں اسکول نہیں جاؤں گا۔''

''میں تمہیں کتنی بار سمجھا چکی ہوں، ہمارے پاس ابھی اتنے پیسے نہیں ہیں کہ تمہیں یہ سب چیزیں لے کر دیں۔ اچھے بچے تنگ نہیں کرتے۔ جاؤ تیاری کرو، اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔''

نعمان اور فاطمہ دونوں بہن بھائی تھے۔ فاطمہ، نعمان سے بڑی تھی اور سمجھ دار بھی تھی مگر نعمان ایک ضدی لڑکا تھا۔ آئے دن اپنے غریب ماں باپ کے سامنے کبھی کھلونوں کا اور کبھی کپڑوں کا اور کبھی زیادہ جیب خرچ لینے کا مطالبہ کرتا تھا۔ اس کے ابو ایک سبزی فروش تھے اور ان کی آمدنی بھی قلیل ہوتی تھی اور اوپر سے مہنگائی کی وجہ سے دکان کا کرایہ، بجلی کا بل اور دوسری کھانے کی اشیاء کی قیمتیں بھی بڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے دوسرے والدین کی طرح اپنے بچوں کو ایک اچھے اسکول میں داخل کروایا تھا۔ نعمان کی امی اس کو ہر مرتبہ بہلا کر ٹال دیتیں مگر آئے دن وہ اسی طرح سے ضد کرتا۔ اس کے ابو اس کی دل جوئی کے لیے چیزیں دلوانے کا قصد کر لیتے اور کام سے فراغت کے وقت اسے کئی چیزیں لا کر بھی دیتے تھے۔ اکثر ان کا ہاتھ تنگ ہی رہتا تھا۔ اسکول میں بھی بچوں کو اجلی یونی فارم، خوب صورت کتابوں اور زیادہ جیب خرچ دیکھ کر اس کا جی بھی للچاتا کہ کاش! یہ سب چیزیں اس کے پاس بھی ہوں۔ پھر خیال کرتا کہ میرے والدین تو غریب ہیں، وہ مجھے یہ

سب کچھ کیسے لے کر دیں گے۔ وہ اپنے والدین کو ستاتا تھا اور ضد پر اڑا رہتا تھا۔ اسی طرح ایک دن بریک کے وقت نعمان اور اس کے دو دوست شاہ زیب اور فیصل اپنے گھریلو حالات کے بارے میں تبصرہ کر رہے تھے۔

شاہ زیب نے کہا: ''میرے ابو شہر کے نامور ڈاکٹر ہیں اور تمام لوگ علاج کے لیے میرے ابو کے پاس آتے ہیں۔ میں اپنے ابو کو کسی چیز کی فرمائش کروں تو وہ یوں لاکر دیتے تھے۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ابو پولیس آفیسر ہیں۔ بڑے بڑے مجرم میرے ابو سے ڈرتے ہیں۔ میں اگر کسی چیز کا نہ بھی کہوں تو وہ فوراً دلوا دیتے تھے۔'' فیصل بھی اپنا اثر ورسوخ دکھانے کے لیے پیچھے نہ رہا۔ پھر دونوں نے نعمان کے حالات کے بارے میں استفسار کیا مگر نعمان کا اپنے دوستوں کو اپنے ابو کا پیشہ بتانا، سورج کو چراغ دکھانے کے برابر تھا۔ جب نعمان نے روکھے پن سے سبزی فروش کہا تو دونوں دوست ہنسنے لگے۔ ''پھر تو تمہاری ہر فرمائش پوری ہو جاتی ہوگی۔'' شاہ زیب نے طنزیہ کہا۔ اس سے نعمان کا دل بھر آیا اور پھر تمام دن اپنے آپ کو کوستا رہا۔ ان باتوں سے نعمان احساس کمتری کا شکار ہو جاتا تھا اور وہ اس کا شدت سے اپنی امی کے سامنے اظہار کرتا تھا اور بعض دفعہ وہ مطالبات کی بوچھاڑ کر دیتا تھا اور ضد میں آ کر کھانا نہیں کھاتا تھا۔ ایک شام نعمان کے ابو کام سے فارغ ہو کر گھر آ رہے تھے کہ اچانک سڑک پار کرتے وقت ایک گاڑی ان کے کندھے سے ٹکرا کر گزر گئی اور وہ اس کی تاب نہ لاتے ہوئے سڑک پر گر پڑے۔ چند مقامی لوگوں نے انہیں ایمبولنس کے ذریعے سول اسپتال پہنچایا۔ اسپتال میں فوراً نعمان کے چچا اور ماموں بھی پہنچ گئے۔ ان کو خراشیں اور گہرے زخم آئے تھے۔ پھر کچھ لمحات کے بعد ڈاکٹروں نے چند دن آرام کرنے کا مشورہ دے کر رخصت کر دیا تھا۔ نعمان اور اس کی بہن فاطمہ گڑگڑا کے رب کے حضور اپنے ابا جان کے لیے شفایابی کی دعا کر رہے تھے۔ جب سے یہ حادثہ پیش آیا تھا، نہ تو نعمان ضد کرتا تھا اور نہ ہی زیادہ جیب خرچ کا مطالبہ کرتا تھا۔ وہ اپنے ابو کی حالتِ زار کو دیکھ کر قناعت اختیار کیے ہوئے تھا۔ اب نعمان کو اپنے گھریلو حالات کا احساس ہونے لگا تھا۔ اسکول والے فیس کا مطالبہ کر رہے تھے۔ نعمان کے ابو نے تیسرے دن بستر سے اُٹھتے ہوئے دکان پہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ''ار...... ارے...... کہاں جا رہے ہو۔ ابھی تو زخم بھی مندمل نہیں ہوئے۔'' فہمیدہ نے برتن دھو کر اُٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگر کام پر نہ جاؤں گا تو نعمان کی فرمائش کیسے پوری کروں گا، ورنہ وہ اسکول نہیں جائے گا۔'' نعمان کے ابو نے جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''رکیے ابا جان! مجھے اب پڑھائی کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ میں شرمندہ ہوں، میں نے آپ کو بہت ستایا۔ مجھے معاف کر دیں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ جو کچھ ملے گا بس اسی پر قناعت کروں گا۔ نعمان نے اپنے ابو کے قریب رک کر سر جھکا کر کہا۔ اس پر اس کے امی ابو ششدر رہ گئے۔ ان کے لیے یہ لمحہ کسی خوشی سے کم نہ تھا۔ نعمان نے ایک ایسا فیصلہ کیا تھا جو بہت سے بچے نہیں کرتے۔

(دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

خدمت

(محمد زوہیب، کوہاٹ)

اللہ دتا پنجاب کے ایک دور دراز کے دیہات کا کسان تھا۔ اللہ دتا کا بیٹا ذیشان بہت ہی ذہین لڑکا تھا۔ اللہ دتا اپنے بیٹے کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتا تھا مگر گاؤں کا چوہدری رکاوٹ بنا ہوا تھا۔ چوہدری تعلیم کے بہت خلاف تھا۔

کچھ عرصہ قبل ایک کسان حیدر نے اپنے بیٹے کو تعلیم کے لیے شہر بھیجا تو چوہدری اور چوہدری کے بندوں نے یہ کہہ کر کہ تم ہمیں نیچا دکھانا چاہتے ہو حیدر اور اس کے بیٹے کو قتل کروا دیا۔

اللہ دتا کچھ ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا اور گاؤں کے بچے بھی تعلیم حاصل کر سکیں۔ آخر اس کے ذہن میں ایک منصوبہ آ گیا اور اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ بھی پہنانا شروع کر دیا۔ وہ روزانہ صبح منہ اندھیرے چوہدری صاحب کے حجرے میں چلا جاتا اور حجرے کی صفائی اور مال مویشی کو چارہ ڈال دیتا۔ چوہدری اس کے اس طریقہ کار پر بہت حیران ہوا اور جب پانچ دن گزر گئے تو چوہدری صاحب نے اس سے کہا کہ تمہارا کوئی کام ہے بتاؤ تاکہ میں اسے پورا کر دوں مگر اللہ دتا نے انکار کر دیا کہ اس کا کوئی کام نہیں ہے۔

اب اللہ دتا روزانہ چوہدری کے ہاں جاتا اور انہیں نرمی اور حکمت سے علم کی عظمت پر قائل کرنے لگا۔

چوہدری نے اس کے اچھے رویے سے متاثر ہو کر اس کی ہر خواہش پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔

جب چوہدری صاحب کے اصرار پر اللہ دتا نے کہا کہ گاؤں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے اسکولز بنائے جائیں تاکہ دوسرے دیہاتوں کی طرح ہمارا دیہات بھی ترقی کر سکے۔

چوہدری صاحب اللہ دتا سے اتنے متاثر ہوئے تھے کہ گاؤں میں دو اسکول قائم ہو گئے اور درس و تدریس کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔ اس گاؤں کے بہت سے بچے بڑے ہو کر انجینئر، ڈاکٹر، فوجی، پولیس مین اور اعلیٰ شعبوں میں جا کر اپنے گاؤں اور ملک و قوم کا نام روشن کرنے لگے۔

اللہ دتا اور چوہدری صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں لیکن ان کی روحیں اپنے گاؤں کی ترقیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں گی۔

ساتھیو! اچھے رویے اور خدمت سے انسان پتھر دل کو بھی جیت لیتا ہے جس طرح اللہ دتا نے کیا اور گاؤں کو ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا۔ گاؤں کی کئی نسلیں اللہ دتا کی اس خدمت کو سلام کرتی رہیں گی۔

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

صبر کا پھل

(عائشہ ملک، چشمہ)

احمد صاحب گاڑی میں اپنے گھر جا رہے تھے کہ ان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے بٹن دبایا اور کان کے ساتھ لگایا۔ دوسری طرف کارخانے کا مینیجر گھبرائی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''احمد صاحب ہم لٹ گئے ہم تباہ ہو گئے۔'' احمد صاحب نے بوکھلا کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟'' فیکٹری کے مینیجر نے بتایا کہ کارخانے کو آگ لگ گئی ہے۔

انہوں نے گھبراتے ہوئے کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔'' انہوں نے اپنی کار کی رفتار بھی تیز کر دی۔ گھبراہٹ کی وجہ سے وہ صحیح طور پر گاڑی نہ چلا سکے اور ایک تیز رفتار موٹر سائیکل سے ان کی گاڑی کی ٹکر ہو گئی۔ احمد صاحب زخمی ہو گئے۔ لوگوں نے انہیں اسپتال پہنچایا۔ جب ان کو ہوش آیا تو انہیں خبر ملی کہ کارخانے کے ساتھ ساتھ ان کا شان دار گھر بھی تباہ ہو چکا ہے۔ گاڑی بھی ٹکر کی وجہ سے تباہ ہو گئی تھی۔ جب گھر پہنچے تو دیکھا تو وہاں صرف ملبے کا ڈھیر تھا۔ احمد صاحب نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ان کے دوست فرقان نے انہیں دلاسا دیا اور کہا کہ احمد صاحب! اللہ کو یہی منظور تھا۔ انہوں نے مڑ کے دیکھا، وہ فرقان صاحب تھے۔ فرقان صاحب، احمد صاحب کے پڑوسی تھے۔ وہ ان کو اپنے گھر لے گئے۔ بیگم احمد صاحب کو دیکھ کر رونے لگ گئی۔ فرقان صاحب نے سب کو دلاسا دیا۔ اتنے میں اذان کی آواز آئی۔ انہوں نے عشاء کی نماز پڑھی اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جب سب کھانا کھا چکے تو ان کے پڑوسی فرقان صاحب کہنے لگے کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''سب سے سخت آزمائش انبیائے کرامؑ پر آتی ہے، پھر زیادہ نیک لوگوں پر، پھر جو ان سے کم درجے کے ہوں۔'' اور نبی اکرمؐ فرماتے ہیں: ''ہم سب اللہ کی ملکیت ہیں اور ہم سب اسی کی طرف جانے والے ہیں۔ یا اللہ! مجھے اس مصیبت کا ثواب دے اور اس کے بدلے میں اس سے اچھی چیز عنایت فرما۔ جو بندہ اذیت و تکلیف پر صبر کرتا ہے، تقدیرِ الٰہی پر رضامندی کا اظہار کرتا ہے اور ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے اس مصیبت کا بہترین بدلہ عطا فرماتا ہے۔ احمد صاحب اور ان کی بیوی نے یہ باتیں اچھی طرح ذہن نشین کر لیں اور اللہ کی تقدیر پر راضی ہو گئے۔ صبح نماز کے بعد احمد صاحب دعاؤں میں مشغول تھے کہ ان کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں سیٹھ انور بول رہا ہوں۔'' سیٹھ انور؟ ان کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ ''جی ہاں! میں سیٹھ انور بول رہا ہوں اور میں حج کر کے واپس آ رہا ہوں۔ اللہ نے مجھے ہدایت دی ہے۔ میں نے آپ سے معافی مانگنے کے لیے فون کیا ہے۔ میں نے آپ کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی اور آپ کا بہت مال کھایا تھا، لہٰذا آپ مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنے کیے پر نادم ہوں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ فیصل آباد میں میری کپڑوں کی فیکٹری ہے، وہ آپ کی رقم کے بدلے میں آپ کو دے دوں۔ میں کل آپ کا انتظار کروں گا۔ آپ میرے پاس تشریف لے آئیں اور کل سے آپ اس فیکٹری کے مالک ہیں۔'' احمد صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ سوچنے لگے کہ اتنی جلدی اللہ نے ان کے صبر کا صلہ دے دیا۔ وہ اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگے۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

غرور کا انجام

(حسن بدر، بورے والا)

کسی گاؤں میں ایک لالچی مگر دولت مند رہتا تھا جو بہت زیادہ کنجوس تھا۔ کسی کی مدد نہ کرتا، اگر کوئی سوالی اس کے دروازے

پر صدا دیتا تو وہ غصے سے لال پیلا ہو جاتا اور نوکروں کو حکم دیتا کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دے اور خود چیخ چیخ کر کہتا۔ ''یہ موٹا تازہ کتنا بے حیاء ہے کہ مانگ کر کھاتا ہے اور شرم نہیں آتی۔''

ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ اس دولت مند کے گھر کے پاس بچے کھڑے ہو کر ایک قسمت کے مارے نے سوال کیا تو اس نے حسب عادت ملازمین کو حکم دیا کہ اسے دھکے مار کر باہر نکال دیں۔ چناں چہ نوکروں نے فوراً آقا کے حکم کی تعمیل کی اور اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ جب غریب سوالی کو نوکروں نے اپنے آقا کی خوش نودی کی خاطر خوب پیٹا تو وہ سوالی دھاڑیں مار مار کر زار و قطار رونے لگا اور اللہ سے فریاد کی: ''اے اللہ! میری کیا تقدیر ہے کہ قلت روزی سے مجبور ہو کر میرا سوالی بن جانا میرے لیے کم ذلت تھی کہ اس نے میری مزید بے عزتی کی۔ مظلوم کی آہ و بکا سن کر دیکھنے والے بھی انگشت بدنداں تھے اور بعض لوگوں پر اس منظر سے کپکپی طاری ہو رہی تھی۔ مظلوم کی آہ و زاری کچھ ایسے وقت ہوئی کہ غیرت حق جوش میں آ گئی اور تاجر کا کاروبار گھٹنے لگا اور چند دنوں میں وہ مفلس ہو گیا۔ نوکر چاکر اس کی خدمت چھوڑ کر چلے گئے۔ اس تاجر کا وہ نوکر جس نے تاجر کے حکم پر سائل کو دھکے دیئے تھے، مدتوں دھکے کھاتا ہوا کسی دوسرے شہر میں ایک امیر تاجر کے ہاں ملازم ہو گیا۔ یہ تاجر ایک نیک دل انسان تھا۔ وہ غریبوں اور ناداروں کی خوب خدمت کرتا تھا۔ جو سوالی بھی اس کے در پہ آتا تھا، وہ خالی ہاتھ نہ جاتا۔

ایک دن اتفاق ایسا ہوا کہ ایک نادار سوالی نے تاجر کے دروازے پر کھڑے ہو کر سوال کیا۔ ''بھلا ہو بابا! کچھ محتاج غریب کو بھی راہِ خدا مل جائے۔''

مالک نے اپنے نئے ملازم کو حکم دیا کہ جا کر پوچھے کہ سوالی کیا مانگ رہا ہے؟ جب سوالی اس کے پاس گیا تو وہ بہت پریشان اور غمگین لوٹا۔ نیک دل تاجر نے اپنے نئے ملازم سے پریشانی کی وجہ پوچھی تو ملازم نے جواب دیا۔ ''حضور آج کل کی دُنیا کی ناپائیداری کو دیکھ کر شیشۂ دل چور چور ہو گیا۔ یہ بھکاری وہی میرا آقا ہے جو کبھی دولت میں کھیلتا تھا۔''

نیک دل تاجر نے نوکر سے کہا۔ ''لیکن تو نے مجھے نہیں پہچانا؟ میں وہی سوالی ہوں جسے تو نے اپنے آقا کے کہنے پر دھکے دیئے اور مارا تھا۔ یاد رکھو! دولت دھوپ چھاؤں کی طرح ہے۔ اس پر غرور نہیں کرنا چاہیے۔''

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

ڈینگی

ڈینگی آیا ڈینگی آیا
وحشت لایا دہشت لایا
خائف اس سے بچے بوڑھے
قریہ قریہ کوچے کوچے
کاری اس کا وار بہت ہے
ہیبت اس کی چار جہت ہے
اس کا حملہ شام سویرے
کوڑا کرکٹ اس کے ڈیرے
ڈنک میں اس کے زہر بھرا ہے
جس کو کاٹا حال بُرا ہے
منہ سے خوں اور تپ کی حدت
اُبکائی کی اس پر شدت
سر چکرائے دل گھبرائے
اِک لمحہ بھی چین نہ آئے
اِک اِک جوڑ ہلا دیتا ہے
آنسو خوں کے رُلا دیتا ہے
اس سے بچ کر رہنا ہو گا
کام یہ سب کو کرنا ہو گا
شب کو لگانا مچھر دانی
ڈھک کر رکھنا باسن پانی
بازو اپنا کھلا نہ رکھنا
صبح کو ڈھکنا شام کو ڈھکنا
لوشن روز لگاتے رہنا
ڈینگی دُور بھگاتے رہنا
آتا ہے پھر جاتا نہیں ہے
بچہ اس کا پلتا یہیں ہے
ڈنکا اس کا بجنے نہ دینا
اس سے ہر دم لڑتے رہنا
اللہ سب کو اس سے بچائے
یہ بیماری یاں سے جائے

خورشید عالم صدیقی، لاہور

گولف اُمراء کا کھیل

نسرین شاہین

گولف کوئی عام نہیں بلکہ خاص کھیل ہے۔ یہ کھیل مہنگا ہونے کی وجہ سے دُنیا کے امیر اور ترقی یافتہ ممالک میں کافی مقبول ہے۔ اس کھیل کی تاریخ بہت پُرانی ہے۔ خیال ہے کہ اس کھیل نے روم میں کھیلے جانے والے ایک کھیل پیگانیکا(Paganica) سے جنم لیا ہے۔ روم کے باشندے جنہوں نے اسکاٹ لینڈ اور برطانیہ کے کچھ حصوں پر ایک صدی قبل مسیح سے چار صدیوں بعد از مسیح تک قبضہ کئے رکھا، وہ ایک لمبی مڑی ہوئی چھڑی اور پَروں سے بنے ہوئے گیند سے پیگانیکا کھلے میدانوں میں کھیلتے تھے۔ گولف کی مستند تاریخ 1457ء میں ملتی ہے۔ اس سال اسکاٹ لینڈ کے شاہ جیمز دوم کی پارلیمنٹ نے گولف پر پابندی لگا دی کیوں کہ گولف کے رجحان کی وجہ سے تیر اندازی کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہوگئی، جس کی وجہ سے قومی دفاع خطرے میں پڑ گیا تھا۔ گولف سے پابندی اس وقت اُٹھائی گئی جب 1502ء میں برطانیہ اور اسکاٹ لینڈ کے درمیان امن معاہدہ پر دستخط ہوگئے۔

دُنیا کا قدیم کھیل گولف کا سب سے پہلا مشہور گولف کلب 1744ء میں ایڈن برگ اسکاٹ لینڈ میں قائم ہوا۔ اس کلب کا نام رائل گولف کلب (Royal Golf Club) آف سینٹ اینڈریوز ہے جو کہ 1754ء میں قائم ہوا۔ یہ دُنیا کا سب سے پُرانا کلب ہے جو کہ مستقل بنیادوں پر کام کرتا رہا۔ سینٹ اینڈریو کلب گولف کے قوانین و ضوابط اور گولف کی روایات قائم کرنے میں رہنما ثابت ہوا۔ مثال کے طور پر ایک معیاری راؤنڈ کی لمبائی اٹھارہ سوراخوں (Holes) پر بنائی گئی جو کہ آج تک قائم ہے۔

1848ء تک گولف کے کھلاڑی چمڑے کی بنی ہوئی پَروں سے بھری گیند استعمال کرتے رہے۔ اسی سال ایک سخت گیند جس کا نام "Gutty" تھا، استعمال ہونے لگی۔ امریکہ کے ایک کھلاڑی کوبرن ہاسکل نے 1899ء میں مائع سے بھری گولف کی گیند ایجاد کی۔ 1800ء کے آخر تک مزید اچھی تربیت، گولف کے کھیل کے سامان میں بہتری اور سہولتوں میں اضافہ نے بہت سارے کھلاڑیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کھیل کی مقبولیت اور ہر دل عزیزی جلد ہی اسکاٹ لینڈ اور برطانیہ سے آئرلینڈ، کینیڈا اور امریکہ تک جا پہنچی۔ 1873ء میں رائل مونٹریل گولف کلب وجود میں آیا اور امریکہ میں سب سے پہلے 1888ء میں سینٹ اینڈریوز گولف کلب یونکرز، نیویارک میں قائم ہوا۔ امریکہ میں ایمیچور گولف ایسوسی ایشن کا قیام 1894ء میں عمل میں آیا۔ بعد ازاں اس تنظیم کا نام یونائیٹڈ اسٹیٹس گولف ایسوسی ایشن ہوگیا تھا۔

گولف ایک پُرسکون کھیل ہے جس میں کوئی ٹیم یا کھلاڑی کسی کے خلاف نہیں کھیلتا بلکہ ہر کھلاڑی اپنا علیحدہ کھیل پیش کرتا ہے جس میں اس کو مخصوص گیند ایک جگہ سے دوسری جگہ کچھ فاصلے پر بنے ایک سوراخ میں کم از کم اسٹروکس(Strokes) لگا کر ڈالنی ہوتی ہے۔ ایک مکمل راؤنڈ میں کل 18 سوراخ ہوتے ہیں اور کھلاڑی کو باری باری ان سوراخوں میں کم از کم اسٹروکس لگا کر گیند ڈالنی ہوتی ہے۔ یوں ایک کھلاڑی کو 18 سوراخوں میں گیند ڈالنے کے لیے 72 اسٹروکس کی اجازت ہوتی ہے۔ زیادہ اسٹروکس حاصل

کرنے پر اس کی پوزیشن دوسروں کے مقابلے میں مضبوط ہو جاتی ہے۔ ویسے عام طور پر ایسا کم ہی ہوتا ہے کیوں کہ ریلوے گولف کلب کے ریکارڈ میں اب تک 66 اسٹروکس کے ذریعے ایک راؤنڈ مکمل کیا گیا ہے۔ عام طور پر یہ کھلاڑی 72 سے کافی زیادہ اسٹروکس لگا کر راؤنڈ مکمل کرتے ہیں۔

پاکستان میں سابق صدر جنرل ضیاء الحق نے اس کھیل کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ لاہور کا گیریژن گولف کلب بھی انہی کی کوششوں سے وجود میں آیا۔ اس کا ایک دل چسپ پہلو یہ ہے کہ اتفاق سے راول پنڈی میں سی این سی ہاؤس کی دیوار گولف کلب سے ملحقہ تھی۔ جنرل ضیاء الحق نے اس دیوار میں ایک خصوصی دروازہ بنوایا اور فرصت کے چند لمحوں میں گولف کے دو چار اسٹروکس کھیل لیا کرتے تھے۔ انہوں نے پاکستان کے بہت سارے کنٹونمنٹ کے علاقوں میں گولف کلبوں کے قیام کی منظوری دی۔ تاہم یہ کھیل پاکستان میں زیادہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت مہنگا کھیل ہے اور ایک مخصوص طبقے نے اس پر اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گولف کو امیروں کا کھیل کہا جاتا ہے۔

گولف کے کھلاڑی کے ساتھ ایک شخص بڑا سا تھیلا اٹھا کر ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اس شخص کو گولف کی زبان میں ''کیڈی'' کہتے ہیں۔ ایک کلب میں عموماً سو سے ڈیڑھ سو تک کیڈی ہوتے ہیں۔ ایک کیڈی ماسٹر ہوتا ہے جو ان کو کنٹرول کرتا ہے۔ کیڈی کو تقریباً ایک راؤنڈ مکمل کرنے پر مخصوص رقم دی جاتی ہے اور ایک عام کھلاڑی یہ راؤنڈ روزانہ تقریباً تین یا چار گھنٹے میں مکمل کر لیتا ہے۔ غیر ملکی بھی اس کھیل میں دل چسپی رکھتے ہیں جو کیڈی کو زیادہ رقم دیتے ہیں۔ یہ کیڈی بالکل پرائیویٹ ہوتے ہیں، البتہ عام شخص کو بطور کیڈی کلب میں کام نہیں کرنے دیا جاتا۔ یہ مخصوص اور مستقل لوگ ہوتے ہیں جو سارا دن کلب میں کھلاڑیوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ کھیل موسم سرما میں زیادہ کھیلا جاتا ہے، کیوں کہ گرمی کے موسم میں صرف شام کے بعد ہی عموماً یہ کھیل کھیلنا ہوتا ہے۔ ویسے گولف کو سردیوں کا کھیل ہی کہا جا سکتا ہے۔ ایسے ممالک جہاں موسم عام طور پر خوش گوار ہوتا ہے، وہاں پر یہ کھیل سارا سال کھیلا جاتا ہے۔ البتہ وہاں بھی یہ کھیل امراء کے لیے ہی مخصوص ہے۔ پاکستان میں گولف نے خاص شہرت حاصل نہیں کی۔ یہ کھیل بڑے شہروں کے امراء اور بڑے افسران ہی کھیلا کرتے ہیں۔ لاہور شہر میں تین گولف کلب شہر کے وسط میں لاہور کی بڑی شاہراہوں پر واقع ہیں۔ ان میں ایک کلب جو سب سے پُرانا ہے، وہ ریلوے کی اراضی پر بنایا گیا ہے، اس کا نام ریلوے گولف کلب ہے۔ اس کلب کا رقبہ ساڑھے چار مربع اراضی پر مشتمل ہے۔ یہ کلب 1912ء میں بنایا گیا تھا۔ اس کلب میں پروفیشنل کھلاڑی بہت کم تعداد میں اور شوقیہ کھیلنے والے زیادہ ہیں۔ لاہور میں دوسرا بڑا جم خانہ گولف کلب ہے جو شاہراہ قائداعظم پر مہنگے ترین علاقہ میں واقع ہے۔ اس کا رقبہ 800 کنال ہے جب کہ پہلے بڑے گولف کلب کا رقبہ 900 کنال اراضی پر مشتمل ہے۔ لاہور میں تیسرا بڑا گولف کلب گیریژن گولف کلب ہے جو کہ پاکستان آرمی کے ماتحت ہے۔ یہ کلب 1984ء میں شروع کیا گیا۔ یہ لاہور کے پرانے ایئرپورٹ سے منسلک ٹرمنل کے ساتھ واقع ہے اور یہ کلب 120.39 ایکڑ یعنی 1000 کنال اراضی پر مشتمل ہے۔ یہ کلب 1990ء میں مکمل ہوا۔ شروع میں یہ کلب صرف نو سوراخوں پر مشتمل تھا، بعد میں 18 سوراخوں تک لا کر مکمل کر لیا گیا۔ یہاں زیادہ تر ممبران مسلح افواج سے تعلق رکھتے ہیں، ویسے ممبر شپ عام آدمی کے لیے بھی ہے۔

پاکستان کے پاس کوئی بھی بین الاقوامی ٹائٹل گولف کے کھیل کے حوالے سے نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس کھیل کے پروفیشنل کھلاڑی اور ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان گولف کلبوں کے قیام کا مقصد مخصوص طبقہ کے لوگوں کے لیے ہی تفریح اور راحت فراہم کرنا ہے؟ ان تمام کلبوں کا انتظام افسران کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ گولف کے میدان میں کوئی اور کھیل نہیں کھیلا جا سکتا جب کہ دوسرے کھیل کے میدان اور اسٹیڈیم بہت سے دوسرے کلبوں کے لیے بھی استعمال ہوتے ہیں۔ گولف کلب صرف اسی کھیل کے لیے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ پاکستان میں گولف کو زیادہ مقبولیت اس لیے بھی نہ مل سکی کہ حکومتوں نے اس کھیل کے فروغ کے لیے توجہ ہی نہیں دی، یوں یہ کھیل امراء کے لیے ہی رہ گیا۔ عام لوگ آج بھی گولف سے دُور یا محروم ہیں۔

☆☆☆

کر بھلا ہو بھلا

"گل خان آج کسی بھی طرح کچھ پیسوں کا انتظام کر لو اور شام کو ذرا جلدی گھر آ جانا تا کہ ہم ماریہ بچی کو کسی ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے سکیں۔ آج میں نے بخار کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے اور جسم پر ننھے ننھے دانے بھی دیکھے ہیں، مجھے لگتا ہے ماریہ بھی خسرے جیسی جان لیوا بیماری کا شکار ہو چکی ہے۔" گل خان کی والدہ نے غم زدہ ہو کر گل خان سے کہا۔

گل خان ایک غریب ٹیکسی ڈرائیور تھا۔ اس کا گھرانہ بیوی، چار بچوں اور بوڑھے والدین سمیت آٹھ افراد پر مشتمل تھا۔ کبھی سی این جی کی عدم دستیابی اور کبھی شہر کی کشیدہ صورتِ حال کے پیشِ نظر اکثر گل خان سارا دن خوار ہونے کے باوجود خالی ہاتھ ہی گھر آتا، جس سے کبھی اس کے گھر کا چولہا جلتا اور کبھی فاقہ کرنا پڑتا۔ گل خان اپنی والدہ کی بات سن کر پریشان ہو گیا، پھر خود کو سنبھال کر اپنی والدہ اور بیوی کو تسلی دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "ان شاء اللہ! آج ضرور اللہ تعالیٰ مدد کرے گا اور شام کو ہم اپنی ماریہ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر چلیں گے۔" کہنے کو تو گل خان نے انھیں تسلی دی تھی مگر خود کشمکش کی کیفیت سے دوچار تھا کہ نجانے چڑھتے سورج کے ساتھ شہر کے کیا حالات ہوں۔ پھر اس نے مایوس کن خیالات کو ذہن سے جھٹک کر سوچا کہ رزق تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کے ذمے محنت کرنا ہے۔ اللہ مسبب الاسباب ہے، وہ یقیناً اچھا ہی کرے گا۔ اسی مثبت سوچ کے ساتھ اس نے اپنی ٹیکسی سڑک کی طرف بڑھائی۔ فوراً ہی اسے ایئرپورٹ کی سواری مل گئی جس نے بغیر بحث کیے مناسب کرایہ ادا کیا، جس سے گل خان کو کافی حوصلہ ملا۔ وہ اگلی سواری کی تلاش میں جیسے ہی ایک بڑی شاہراہ پر آیا لوگوں کا جم غفیر دیکھ کر معلوم کرنے لگا کہ کیا معاملہ ہے۔ "ایکسیڈنٹ ہے اور زخمی پڑا تڑپ رہا ہے۔" ایک راہ گیر نے اسے بتایا۔ یہ سنتے ہی گل خان تیزی سے اپنی گاڑی سے باہر آیا اور مجمع کو چیرتا ہوا زخمی تک پہنچا۔ زخمی شخص تقریباً اٹھارہ سالہ نوجوان تھا۔ پیچھے سے ٹکر لگنے کی وجہ سے اس کی موٹر سائیکل فٹ پاتھ سے ٹکرا کر شدید ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکی تھی۔ نوجوان کے سر سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ اتنی سنگین صورتِ حال میں بھی لوگوں کی بھیڑ صرف تماشا دیکھنے میں مصروف تھی۔ کوئی اس نوجوان کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھ رہا تھا۔ گل خان نے چیخ کر کہا۔ "ارے ظالمو! یہ شدید زخمی ہے، کس نے اسے اس حال میں پہنچایا ہے؟ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے یہ مر بھی سکتا ہے۔ کوئی میری مدد کو آئے، اسے کسی قریبی ہسپتال لے چلتے ہیں۔" مجمع میں سے کوئی بھی شخص آگے نہ بڑھا۔ گل خان کہتا رہا۔ "ارے بھائیو! یہ کیسی مسلمانیت ہے، ہمارے آقا

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، جس کے ایک حصے کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس تکلیف کو دوسرے تمام اعضاء بھی محسوس کرتے ہیں۔" اتنا کچھ سن کر بھی کوئی آگے نہ بڑھا بلکہ بھیڑ چھٹنے لگی۔ گل خان نے اپنی پوری ہمت کر کے تقریباً گھسیٹتے ہوئے نوجوان کو اپنی ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا اور تیزی سے اسے اسپتال لے کر بھاگا۔ راستے میں وہ پلٹ پلٹ کر نوجوان کو دیکھتا بھی رہا۔ گل خان نوجوان کو لے کر اسپتال پہنچ گیا مگر اب ڈاکٹروں کے نخرے شروع ہو گئے، وہ پولیس کیس کہہ کر ٹال مٹول کر رہے تھے۔ کسی ڈاکٹر کو اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داری کا احساس نہیں تھا۔ گل خان ان کی بے حسی پر رو پڑا۔ گڑگڑا کر منتیں کرنے لگا۔ نوجوان کا خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ "آپ کم سے کم ابتدائی طبی امداد دے کر اس کے بہتے خون کو تو کنٹرول کریں۔" "کیا یہ تمہارا رشتے دار ہے؟" ایک ڈاکٹر نے پوچھا۔ "نہیں، مگر بحیثیت مسلمان یہ ہم سب کا رشتہ دار ہے۔ اس کی زندگی بچانا ہم سب کی مذہبی ذمہ داری ہے۔" "اچھا تو تم خود ہی اسے مار کر انسانی ہمدردی کا ہمیں درس دے رہے ہو۔" ڈاکٹر نے نخوت سے کہا۔ "نہیں، نہیں...... بخدا ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں تو اس کا بہتا خون دیکھ کر اس کی زندگی بچانے کے لیے سڑک سے اُٹھا کر لایا ہوں۔" گل خان نے بھی ہراساں ہو کر کہا۔ "یہ تو ابھی پولیس آ کر خود ہی پتا لگا لے گی کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔" اتنا کہہ کر ڈاکٹر نے پولیس کو کال کر دی۔ پولیس نے آتے ہی گل خان کو حراست میں لے لیا۔ زخمی نوجوان کی تلاش پر اس کی جیب سے گھر کا رابطہ نمبر ملا۔ ڈاکٹر احسان جتا کر زخمی نوجوان کو ایمرجنسی میں لے گئے اور گل خان سے پوچھا۔ "اس کے لیے خون کا بندوبست کون کرے گا؟" اس نے فوراً کہا۔ "میں ہوں ناں اس کا مسلمان بھائی، اگر میرا خون میچ کرتا ہے تو جتنا چاہیے لے لو۔" پولیس نے نوجوان کے گھر اطلاع کر دی۔ گل خان زخمی نوجوان کو خون دے چکا تھا جو اتفاق سے میچ ہو گیا تھا۔ گل خان ایک شکار کی صورت میں پولیس کے نرغے میں تھا۔ نوجوان کے والد اور بھائیوں کی اسپتال آمد پر پولیس نے ان سے کہا کہ یہ ٹیکسی ڈرائیور ہی مجرم ہے، ہم اسے کئی گھنٹوں سے قابو کیے بیٹھے ہیں۔ آپ ہمیں فوری طور پر 20 ہزار روپے دیں تاکہ ڈرائیور کو تھانے لے جا کر کارروائی کی جا سکے۔ زخمی نوجوان جس کا نام فیاض احمد تھا، وہ بھی ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے اپنے والد کو بتایا کہ میری بائیک کو ایک بڑی بس نے ٹکر ماری تھی۔ اس کے والد خود بھی ایک جہاندیدہ اور ذہین شخص تھے اور اپنے ملک کی پولیس کی کارکردگی سے بھی اچھی طرح واقف تھے۔ پھر گل خان نے بھی انہیں شروع سے آخر تک سب کچھ سچ سچ تفصیل سے بتایا تھا۔ اس نے کہا۔ "جنابِ محترم! میں نے یہ سب انسانیت اور بحیثیت مسلمان اپنا فرض نبھایا ہے۔ آپ کے گھر کے چراغ کو گل ہونے سے بچانے کے لیے اپنے جسم سے خون بھی دیا ہے۔ پھر بھی آپ اگر کسی شک وشبہ میں مجھے مجرم سمجھتے ہیں اور نیکی کا صلہ سزا ہے تو میں بخوشی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔" فیاض کے والد نے گل خان کی سچائی کو مانتے ہوئے اسے گلے لگا کر بروقت فیاض کو اسپتال پہنچانے اور خون دے کر اس کی جان بچانے پر تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور بڑی راز داری سے اپنے ساتھ لائے ہوئے 20 ہزار روپے دینے کی کوشش کی جنہیں گل خان نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں نے کسی انعام کے لالچ میں یہ سب کچھ نہیں کیا۔ "مگر ہم تمہیں یہ رقم اپنی مرضی اور بیٹے کی جان بچ جانے کی خوشی میں دے رہے ہیں۔ انکار کر کے تم ہمارا دل نہ توڑو۔" یہ کہہ کر فیاض کے والد نے زبردستی 20 ہزار کی رقم گل خان کی جیب میں ڈال دی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ گل خان کو اپنی ننھی ماریہ کا خیال آیا، اب نہ جانے اس کی طبیعت کیسی ہو گی۔ گل خان نے کل اسپتال میں فیاض کو دیکھنے آنے کے وعدے کے ساتھ فیاض کے والد سے اجازت چاہی۔ فیاض کے والد نے پولیس سے یہ کہہ کر گل خان کی جان چھڑائی کہ گل خان اگر قصور وار ہے بھی تو ہم نے اپنے بیٹے کی جان بچ جانے کی خوشی میں اسے معاف کر دیا۔ اب اسے جانے دو۔ یہ کہہ کر فیاض کا والد خود اسے ٹیکسی تک چھوڑنے آئے۔ گل خان نے اپنے گھر کی جانب آتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا، جس نے اسے نیکی کی توفیق دی۔ اب میں اس رقم سے اپنی ننھی ماریہ کا مکمل علاج اور بوڑھے والدین کی نظر کے چشمے جو تنگ دستی کی وجہ سے وہ نہیں کر پا رہا تھا، بآسانی بنوا کر دے سکوں گا۔ سچ ہے اللہ کی ذات مسبب الاسباب ہے اور اللہ تعالیٰ نیکی کا صلہ ضرور دیتا ہے۔

☆☆☆

ایڈیٹر کی ڈاک

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

ہماری طرف سے آپ کی پوری ٹیم کو السلام علیکم۔ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں دو سال سے تعلیم و تربیت کی باقاعدہ قاریہ ہوں۔ آپ کا رسالہ ہمارے گھر میں بہت شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ تمام سلسلے زبردست ہیں۔ امید ہے کہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ یہ رسالہ بہت معلوماتی ہے اور فائدہ مند ہے۔ میں نے حال ہی میں میٹرک کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔ آپ میری مزید کامیابی کے لیے ضرور دعا کیجیے گا۔

(عائشہ صدیقہ، جنید احمد، جہلم)

☆ آپ کے لیے بہت سی دعائیں۔

ڈیئر ایڈیٹر، السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اکتوبر کا شمارہ بہترین تھا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ محاورہ کہانی بھی پسند آئی۔ کہانیوں میں ماں کی آنکھ، ٹوٹے سینگ والا بکرا اچھی لگیں۔ سلسلہ وار ناول دولت پور میں بہت دل چسپ اور اچھا تھا۔ آپ سب کو عید الاضحیٰ بھی مبارک ہو۔ پلیز! میرا خط ردی کی ٹوکری میں مت ڈالیے گا۔ اجازت دیجیے! اللہ حافظ۔ (محمد شعیب سرت، بہاول پور)

السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اب رسالہ 2 تاریخ کو مل گیا تھا۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میرا خط شائع کیا۔ ناول بہت ہی اچھا تھا جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس مہینے کے شمارے نے تو چار چاند تو کیا پانچ چاند لگا دیے۔ اگر تعلیم و تربیت کی تعریف لکھنے بیٹھیں تو بہت سارے صفحات درکار ہوں گے۔ ہم تو لکھ دیں گے لیکن آپ کے پاس رسالہ میں جگہ نہیں ہو گی۔ مجھے اکتوبر میں تعلیم و تربیت پڑھتے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ پچھلے شمارے میں آپ نے میرا صرف خط شائع کیا لیکن میں نے بہت کچھ بھیجا تھا۔ اب بھی میں بہت کچھ بھیج رہا ہوں ضرور شائع کریں۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت اور اس کی ٹیم کو بہت ساری خوشیاں نصیب کرے اور رسالہ کو دن دگنی رات چگنی ترقی دے۔ (آمین)

(رانا بلال احمد، بھکر)

☆ حوصلہ افزائی کا شکریہ! باری آنے پر آپ کی تحریریں شائع ہو جائیں گی۔

السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ اکتوبر کا تعلیم و تربیت زبردست تھا۔ کہانیوں میں ٹوٹے سینگ والا بکرا اور مولا بخش سب سے زیادہ اچھی تھیں۔ کھیل دس منٹ کا بہت اچھا سلسلہ ہے، اسے جاری رکھیے گا۔ آپی میں اب تک تین چار خط لکھ چکی ہوں لیکن آپ نے کوئی بھی شائع نہیں کیا۔ پلیز آپی آپ میرا خط بھی شائع کریں ناں۔ نومبر کے شمارے میں علامہ اقبال کے متعلق زیادہ سے زیادہ مضامین شامل کیجیے گا۔ نومبر میں میری اور میری بہن کی سال گرہ بھی ہے۔ آپی! تعلیم و تربیت کا کہانی نمبر کب شائع ہو گا؟ "دولت پور میں" بہت اچھا ناول تھا۔ اب کوئی اور اچھا سا ناول شروع کریں۔ ہو سکے تو نسیم حجازی کا کوئی تاریخی ناول شروع کر دیجیے گا۔ اچھا خدا حافظ!

(عائشہ شہباز، وہاڑی)

☆ ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی فرمائش پوری کی جائے۔ سال گرہ مبارک ہو۔

محترمہ ایڈیٹر صاحبہ، السلام علیکم! میں آپ کے رسالے تعلیم و تربیت میں پہلی مرتبہ شرکت کر رہی ہوں، امید ہے کہ حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ تعلیم و تربیت نہ صرف مجھے بلکہ میری تمام دوستوں اور میرے تمام گھر والوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں جب تک اسے پورا نہ پڑھ لوں، مجھے سکون نہیں ملتا۔ برائے مہربانی میرا یہ خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہ کریں۔ میں نے یہ خط بڑی محنت سے لکھا ہے۔ مجھے آپ کا یہ رسالہ بے حد پسند ہے۔ اس کی ہر تحریر لاجواب اور متاثر کن ہوتی ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ اگر میں تعلیم و تربیت رسالے کی سالانہ خریدار بننا چاہوں تو اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔ جواب ضرور دیں۔ شکریہ!

(ثروت یعقوب، لاہور)

☆ سالانہ خریدار بننے کے لیے 850 روپے کا منی آرڈر رسالے کے پتا پر بھیجیں۔

کیسے ہیں آپ سب؟ مجھے تعلیم و تربیت بہت پسند ہے۔ اس ماہ کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ جس میں دولت پور میں اور سخی بادشاہ کی طرح بہت سی کہانیاں اچھی لگیں۔ اب میرا خط ضرور شائع کیجیے ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔

(محمد عبداللہ ثاقب میر، پشاور)

السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ میں نے دو مہینے سے آپ کا رسالہ شوق سے پڑھنا شروع کیا ہے اور یہ میرا پہلا خط ہے۔ اکتوبر کا شمارہ آؤٹ سٹینڈنگ تھا۔ شروع سے لے کر آخر تک رسالہ پڑھا اور بہت پسند آیا۔ ''پیارے اللہ کے پیارے نام'' کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ یہ سلسلہ خاص طور پر ہم جیسے چھوٹے بچوں کے لیے بہت ہی فائدہ مند ہے۔ لطیفے پڑھ کر میں ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔ فطرت کا گیت، اور دعا قبول ہوگئی، تخی بادشاہ اور ٹوٹے سینگ والا بکرا بہت دل چسپ کہانیاں تھیں۔ محاورہ کہانی نے تو کمال ہی کر دیا۔ میرا خط ردی کی ٹوکری میں نہ ڈالیے گا۔ شکریہ!

(افراح سجاد، ثمانہ سجاد، راول پنڈی)

السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ اکتوبر کا رسالہ ملا۔ بہت ہی عمدہ اور لاجواب تھا۔ تمام کہانیاں بے مثال تھیں۔ ناول ''دولت پور میں'' کا اختتام بہت اچھا تھا۔ سلسلہ ''کھوج لگائیے'' میرا پسندیدہ ہے۔ میں اس سلسلہ میں حصہ لیتی ہوں۔ میری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت دن دگنی رات چگنی ترقی کرے، کیوں کہ یہ واقعی ہماری تعلیم کے ساتھ تربیت بھی کر رہا ہے۔ میں اس کی بہت پرانی لیکن خاموش قاری ہوں۔ آپ سب کو میری طرف سے سلام اور عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔ (جانیتا مغل، گوجرانوالہ)

میں نے آپ کو پہلے بھی خط لکھا تھا مگر شائع نہیں ہوا اور یہ میں دوسری مرتبہ خط لکھ رہا ہوں، پلیز شائع ضرور کیجیے گا۔ میں اس سے پہلے کچھ کہانیاں بھی ارسال کر چکا ہوں۔ برائے مہربانی یہ بتا دیں کہ میں نے جو کہانیاں ارسال کی ہیں کیا وہ آپ کو مل گئی ہیں اور اگر مل گئی ہیں تو وہ قابل اشاعت ہیں یا نہیں؟ (عمیر محمود، اوکاڑہ)

☆ کہانیوں کے سلسلے میں آپ رابطہ کیجیے۔

اس بار تعلیم و تربیت میں شمسی توانائی پر مضمون پسند آیا۔ سلسلہ وار ناول دولت پور میں کی آخری قسط کا اختتام سبق آموز تھا۔ ایڈیٹر کی ڈاک میں ہمیشہ اپنا نام تلاش کرتی ہوں۔ اپنی ردی کی ٹوکری کا ہاضمہ چیک کروائیں۔ آپ بھی لکھیے، اچھا سلسلہ ہے۔ ہاتھی میرا ساتھی پر مضمون دل چسپ لگا۔ دعا ہے کہ تعلیم و تربیت کی روشنی ہر گھر کی زینت بنے۔

(علینہ احمد، راول پنڈی)

السلام علیکم! ایڈیٹر آپی، امید ہے خیریت سے ہوں گی۔ پورا تعلیم و تربیت سٹاف بھی خوش و خرم ہوگا۔ میں اتنے ماہ بعد انٹری دے رہی ہوں۔ لگتا ہے میرے بغیر اداس ہو گئے آپ سب۔ ڈونٹ وری، آئی ایم بیک۔ ارے، ابھی بھی مسکرائے نہیں، چلیں سب مسکرائیے...... آہا! یہ ہوئی ناں بات۔ اکتوبر کا رسالہ ہمیشہ کی طرح سپرہٹ تھا۔ حسین رنگوں کا امتزاج دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ''کوٹھے پر'' ارے، نہیں مجھے، ارے! وہی ہاں جی، ہاں جی ''دولت پور میں۔'' ارے جناب! کچھ بھی کہہ لیں، ہے تو وہ سلسلہ وار ناول ناں...... پھر جھگڑا کیسا؟؟؟ ویسے آپس کی بات ہے، مزے کا تھا۔!!! (مومنہ احسان، فیصل آباد)

میرا تعلق تعلیم کے شعبے سے ہے۔ ہمیں زمانہ قدیم کی چوتھی صدی ہجری تک کی اسلامی درس گاہوں سے روشناس کرایا جائے۔ اس کے علاوہ بچوں کا انسائیکلوپیڈیا میں اسلامی ممالک کے تعارف پر بھی لکھا جائے۔ بالخصوص شمالی افریقہ کے تاریخی مقامات۔

(مظفر علی، حسنات مظفر، فراز علی فخر، راول پنڈی)

☆ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی ہے۔

السلام علیکم! اکتوبر کا شمارہ بہت اچھا تھا۔ تخی بادشاہ، پیارے اللہ کے پیارے نام، ٹوٹے سینگ والا بکرا اور سلسلہ وار ناول دولت پور میں کی آخری قسط بہت اچھی تھی۔ سب کو عیدالاضحیٰ مبارک ہو۔

(ابرار خان ترین، کوئٹہ)

السلام علیکم! میں ایک سال سے تعلیم و تربیت کی خاموش قاری ہوں لیکن اس دفعہ قلم ہاتھ میں اُٹھانا پڑا۔ تمام سلسلے سپرہٹ تھے۔ کہانیوں میں تخی بادشاہ، اور دعا قبول ہو گئی اور مولا بخش اچھی لگیں۔ مجھے 2013ء کے جنوری سے لے کر اکتوبر تک کے رسالے چاہیے۔ میرے خط کو ردی کی ٹوکری سے بچائیے گا۔ (مہر مسرت، بہاول پور)

☆ اس سلسلے میں سرکولیشن مینیجر بشیر راہی صاحب سے رابطہ کیجیے۔

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

انیقہ احسان، سیال کوٹ۔ عثمان اکرم، ملتان۔ وردہ زہرہ۔ رانا سفیان شبیر، بھکر۔ تحریم معراج، لاہور۔ محمد حمزہ مقصود، لاہور۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ محسن علی، حسن ابدال۔ احد غفران، گوجرانوالہ۔ محمد افضل انصاری، چوہنگ۔ محمد احمد رضا قادری، کوٹ ادو۔ حسن رضا سردار، کاموکی۔ محمد ثمامہ قاسمی، محمد انصر قاسمی، محمد زبیر قاسمی، چکسواری۔ ایمان فاطمہ، مریم رضوان، راول پنڈی۔ محمد رمیز بٹ، لاہور۔ محمد مامون اجمل، فیصل آباد۔ تماضر ساجد، صادق آباد۔ آمنہ سلام، اسلام آباد۔ عائشہ سلام، اسلام آباد۔ محمد جنید ناگرہ، ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ عائشہ مجید۔ صباء جاوید، ایبٹ آباد۔ فیضان احمد، اٹک۔ ثمرہ احمد، ڈسکہ۔ حرا سعید شاہ، جوہر آباد۔ انعم محمد حبیب، کراچی۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول

آفتاب احمد

پاکستان ملٹری اکیڈمی بڑی فوج کے مستقبل کے افسران کا ابتدائی تربیتی ادارہ ہے جو پاکستانی بری فوج اور پاکستانی اتحادی ممالک کی افواج کے آفیسر کیڈٹس کو دو سالہ تربیت فراہم کرتا ہے۔ یہ اکیڈمی ایبٹ آباد، خیبر پختونخواہ میں کاکول کے مقام پر واقع ہے۔ اکیڈمی تین تربیتی بٹالین اور بارہ کمپنیوں پر مشتمل ہے۔ ہر سال چونتیس سے زائد اتحادی ممالک کے دو ہزار کیڈٹس پی ایم اے میں تربیت حاصل کرتے ہیں۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی 1220 میٹر کی بلندی پر ایبٹ آباد میں واقع ہے۔ 1853ء میں برطانوی ایڈمنسٹریٹر جیمز ایبٹ کے نام سے منسوب ایبٹ آباد، پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کے علاقے ہزارہ میں واقع ایک شہر ہے جو وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے 50 کلو میٹر شمال مشرق اور صوبائی دارالحکومت پشاور کے 150 کلو میٹر مشرق وادیٔ اوراش (Orash Valley) میں ہے۔ یہ مشرق میں آزاد کشمیر کی سرحد پر واقع ہے۔ یہ شہر خوش گوار موسم اور اعلیٰ معیار کے تعلیمی اور فوجی اداروں کے لیے پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ یہاں کی آب و ہوا موسم سرما اور موسم گرما دونوں میں معتدل ہے، جب کہ دیو دار کے درخت علاقے میں عام ہیں۔ شہر مارکیٹوں اور ٹرانسپورٹ کی تمام قسم کی سہولیات کے ساتھ لیس ہے اور اکیڈمی سے ایک مختصر فاصلے پر ہے۔ اکیڈمی کا یہ محل وقوع نوجوان کیڈٹوں کی تربیت کے لیے بہترین ماحول فراہم کرتا ہے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں اس ادارے کے تصور کا ہی مذاق اُڑایا جاتا تھا۔ بیشتر برطانوی حکام کو یقین تھا کہ ہندوستانی افراد جنٹل مین یا افسر نہیں بن سکتے۔ بعد میں انہوں نے ہندوستان کے پیشہ ور طبقات اور زمین دار اشرافیہ کے افراد بھرتی کیے جنہیں وہ جنٹل مین گردانتے تھے۔ برطانوی راج سے آزادی کے بعد آزاد مملکت پاکستان میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کو ویسٹ پوائنٹ اور سینڈ ہرسٹ کی طرز پر جنٹل مین کیڈٹس کو جونیئر افسران بنانے کے لیے 1948ء میں قائم کیا گیا۔

اکیڈمی کے موجودہ مقام کو 1947ء میں تقسیم سے پہلے ابتدائی طور پر برطانوی بھارتی فوج کے ایک جسمانی تربیت اور پروتاروہن اسکول (Army School of Mountaineering and Physical) کے احاطے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ یہ بوئر جنگ کے قیدیوں کے لیے ایک پُرانے جنگی قیدی کیمپ کی عمارت بھی رہی اور بعد میں رائل انڈین آرمی سروس کور اسکول (Royal

Indian Army Service Corps School) کی عمارت کے طور پر بھی استعمال ہوئی۔

1947ء میں پاکستان اور بھارت کے درمیان پرانی بھارتی فوج کی تقسیم کے بعد کمانڈر انچیف بھارت، فیلڈ مارشل سر کلاڈ آکنلک نے بریگیڈیئر فرانسس انگل کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کے پہلے کمانڈانٹ کے طور پر منتخب کیا۔ انہوں نے سینڈ ہرسٹ کی طرز پر پاکستانی اکیڈمی کی طرز تربیت کا تعین کیا۔ خوش قسمتی سے انہیں فوج کے افسران کی ایک بڑی تعداد کی حمایت حاصل تھی۔ ان میں لیفٹیننٹ کرنل عتیق الرحمن بھی شامل تھے۔ دہرادون میں بھارتی فوجی اکیڈمی جیسی سہولیات نہ ہونے کے باوجود بریگیڈیئر انگل نے اپنے کیڈٹوں اور اساتذہ کے اعتماد کو جیت لیا۔ 1947ء میں تازعہ الحاق جموں وکشمیر پر بھارت اور پاکستان کے درمیان مسلح تصادم کی وجہ سے انہوں نے اکیڈمی کی تربیت یوں تشکیل دی کہ زیرتربیت کیڈٹ تربیت کے اختتام پر فوراً محاذ پر یا یونٹ میں جانے کے قابل تھے۔ 1950ء میں کمانڈانٹ کے طور پر اپنی مدتِ عہدہ مکمل کرنے کے بعد انہیں آرڈر آف برٹش ایمپائر (OBE) سے نوازا گیا۔

آئی ایم اے سے 66 کیڈٹ اکتوبر 1947ء میں کاکول پہنچے۔ پہلے پی ایم اے لانگ کورس کے لیے 78 نئے کیڈٹس اور پہلے گریجویٹ کورس کے 63 کیڈٹس کو پاکستان میں منتخب کیا گیا۔ ان کی تربیت جنوری 1948ء میں باضابطہ طور پر شروع ہوئی۔ 25 جنوری 1948ء کو فرسٹ پاکستان بٹالین قائم کی گئی۔ یہ بٹالین مسلم فوجی تاریخ کے تابندہ ستاروں (خالد، طارق، قاسم اور صلاح الدین) کے نام پر قائم کردہ چار کمپنیوں پر مشتمل ہے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کو مختلف ادوار میں اعزازات عطا کیے گئے جو اس کے لیے وجہ افتخار ہیں۔

1965ء کی جنگ اکیڈمی کی توسیع کی وجہ بنی۔ اکیڈمی کی دوسری بٹالین دسمبر 1965ء کو قائم کی گئی۔ یہ بٹالین غزنوی، بابر، اورنگ زیب اور ٹیپو نامی چار کمپنیوں پر مشتمل ہے۔ اوائل 1989ء میں اکیڈمی کی تیسری بٹالین قائم کی گئی۔ تیسری بٹالین کی چار کمپنیاں حیدر، عبیدہ، سعد اور حمزہ ہیں۔

اکیڈمی کا تربیتی فلسفہ محض جنگ کی تربیت ہی نہیں دیتا بلکہ اکیڈمی اس طرح کا ماحول فراہم کرتی ہے کہ ہر کیڈٹ میں ہمت، نظم و ضبط، بلند کردار، وقار، عزت اور حب الوطنی کی صفات پیدا ہوں۔ اکیڈمی آج کے کیڈٹوں کو کل کے افسران بنا کر، اختیار کے استعمال کے لیے ضروری علم اور حکمت سکھاتی ہے۔ فوج کے تمام نوجوان افسران پر اعلیٰ افسران کا احترام لازم ہے اور یہ صفتِ کردار اکیڈمی پیدا کرتی ہے۔ ہر کیڈٹ پر فوج میں شامل ہونے کا مقصد واضح ہونا ضروری ہے۔ ایک واضح ذہن کے ساتھ ہر کیڈٹ کو جاں فشانی اور بلند حوصلہ کے ساتھ کام کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ کیڈٹ کو خطرہ مول لے کر صفِ اوّل سے اپنی ٹیم کی قیادت کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیے، لہٰذا منظم گروہی کام اور اتحادِ عمل، غیرنصابی سرگرمیوں اور جنگی مشقوں کا ایک اہم حصہ ہیں۔

اکیڈمی ایک چار سالہ گریجویٹ پروگرام میں خالص فوجی مضامین کے علاوہ انگریزی، فوجی جغرافیہ، قومی و بین الاقوامی امور، اسلامی تعلیمات، فوجی و عمومی سائنس اور معاشرتی سائنس جیسے مضامین پر مشتمل بیچلر آف ملٹری آرٹس اینڈ سائنسز (BMAS) کی ڈگری فراہم کرتی ہے۔ لانگ کورس کیڈٹس کمیشن سے پہلے ڈگری کے لیے دو سال کی پڑھائی اکیڈمی میں اور بقایا دو سال بطور کمیشنڈ آفیسر اپنی یونٹ میں مکمل کرتے ہیں۔ اکیڈمی سے پاسنگ آؤٹ پر ہر گریجویٹ جنٹل مین

کیڈٹ کم از کم گریجویشن کا حامل ہوتا ہے، سوائے لانگ کورس کیڈٹس کے جو اپنی تعلیم یونٹ میں مکمل کرتے ہیں۔

اکیڈمی کی مرکزی لائبریری میں تقریباً ہر موضوع پر کتابوں، رسالوں اور تحقیقی مواد کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ لائبریری کے ساتھ ساتھ اکیڈمی میں تین بڑے پیمانے کی کمپیوٹر تجربہ گاہیں اور چار تازہ ترین کمپیوٹر کنٹرولڈ لسانی تجربہ گاہیں بھی ہیں۔ کیڈٹوں کے لیے موجودہ قومی اور بین الاقوامی خبروں سے آگاہ ہونا ضروری ہے، لہٰذا پی ایم اے نے اپنا نشریاتی رابطہ بھی قائم کیا ہے۔ مندرجہ بالا کورسز اور سہولیات کے علاوہ مندرجہ ذیل انجمن اور مجالس بھی موجود ہیں:

○سائنس کلب ○فنون لطیفہ کلب ○حرفہ وصنعت کاری کلب ○ تمثیل نگاری کلب ○بحث وتقاریر کلب ○موسیقی کلب ○تصویر کشی کلب ○ادبی کلب ○ گرافکس کلب۔

اکیڈمی کا جسمانی معیار بہت اعلیٰ ہے اور جنٹل مین کیڈٹوں سے مختلف آزمائشوں میں کام یاب ہونے کی توقع کی جاتی ہے۔ مطلوبہ جسمانی معیار میں اگلی ٹرم یا تربیتی مدت میں ترقی کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا ہے۔ پہلی، دوسری، تیسری یا چوتھی مدت یا ٹرم کے تمام کیڈٹوں کے لیے بنیادی معیار چھ منٹ کے اندر ایک میل (1.6 کلو میٹر) بھاگ کر مکمل کرنا ہے۔ دوسری آزمائشوں میں پُش اپ، سِٹ اپ، چن اپ، رسّی چڑھنا، نو میل (14 کلومیٹر) بھاگنا، اسالٹ کورس، ایسڈ ٹیسٹ اور ہارس ٹیسٹ کی طرح جسمانی پھرتی کی آزمائشیں شامل ہیں۔ یہ آزمائشیں ایک کیڈٹ کی عمومی جسمانی صلاحیت اور طاقت کی جانچ کرتی ہیں۔ لیڈی یا خاتون کیڈٹس کو بھی جنٹل مین کیڈٹوں کی طرح جسمانی آزمائشوں پر عبور حاصل کرنا ہوتا ہے لیکن معیار قدرے کم ہوتا ہے۔ تمام لیڈی کیڈٹس کے لیے بنیادی معیار دس منٹ کے اندر اندر ایک میل (1.6 کلو میٹر) بھاگ کر مکمل کرنا ہے۔ دوسری آزمائشوں میں پُش اپ، سِٹ اپ، ڈنڈے سے لٹکنا، اسالٹ کورس اور جنٹل مین کیڈٹوں کے ساتھ ایک فیلڈ یا میدانی مشق 'قیادت' میں شامل ہونا بھی شامل ہے۔ ان کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ گھڑسواری، نشانہ بازی، تیراکی اور تلوار بازی کریں یا نہیں۔ خاتون کیڈٹس بھی جسمانی آزمائشی تمغہ اور تمغہ فائرنگ کے لیے مقابلہ کرنے کی اہل ہیں۔ کیڈٹوں کی جسمانی فٹنس اور ایڈونچر ازم میں اضافہ کرنے

میں بیرون خانہ کلبوں سے مدد ملتی ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں:

○ پیرا یا چھاتہ بردار کلب ○ گلائڈنگ یا ہوائی پیراکی کلب ○ اینگلنگ کلب ○ پیدل سفر یا ہائکنگ کلب ○ گھڑسوار کلب ○ جوڈو اور کراٹے کلب ○ صحت اور حفظانِ صحت کلب ○ غوطہ خوری کلب ○ نشانہ بازی کلب، شکار کلب

پی ایم اے میں مستقبل کے ممکنہ افسران کو پی ایم اے میں پاکستانی مسلح افواج میں پیشہ ورانہ امور کے لیے ضروری صفات اور خصوصیات پیدا کرنے کے لیے تیار کردہ تربیتی پروگراموں کے ایک سلسلہ سے گزرنا پڑتا ہے۔ تربیتی پروگرام کی کچھ خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

○ ہتھیاروں کا پیشہ ورانہ مہارت کے ساتھ استعمال ○ فیلڈ کرافٹ یا جنگی میدانی مہارت ○ سگنل آلات یا آلاتِ پیغام رسانی کا استعمال ○ ماڈل یا زمینی نمونہ پر بات چیت ○ تعارفی بات چیت ○ فوج کے بغیر جنگی چال یا ٹیکٹیکل مشقیں ○ فوج کے ساتھ یا فیلڈ مشقیں

کیڈٹوں کے لیے تربیتی مشقوں کو تربیتی مدت کے حوالے سے یوں تقسیم کیا گیا ہے:

- پہلی ٹرم یا مدت: فوجی سلام یا سلیوٹ کی جانچ یا ٹیسٹ، کک آف یا ابتدائی فیلڈ مشق۔

● دوسری ٹرم یا مدت: فیلڈ مشق ریموک، فیلڈ مشق تلاشِ راہ یا پاتھ فائنڈر۔ مزید جنٹل مین کیڈٹوں کو ایک طویل تربیتی مدت کے بعد ایک مخالف کے خلاف باکسنگ رنگ میں تین منٹ مکہ بازی بھی کرنی ہوتی ہے۔

● تیسری ٹرم یا مدت: ٹی ایم ریڈرز یا طارق محمود کے حملہ آور فیلڈ مشق، پانی پت فیلڈ مشق اور اسالٹ کورس۔ اسالٹ یا حملہ کورس کو جسمانی تربیتی آزمائش کے ایک حصے کے طور پر شامل کیا جاتا ہے۔

● چوتھی ٹرم یا مدت: فیلڈ مشق قیادت اور ایسڈ یا تیزابی ٹیسٹ، جو تمام جسمانی مشقوں سے مشکل ٹیسٹ ہے۔ تیراکی سیکھنا تمام کیڈٹوں کے لیے لازمی ہے۔

جنٹل مین کیڈٹوں کی تربیت کے لیے انہیں پہلے بٹالین میں اور پھر مزید کمپنیوں اور پلاٹونوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر بٹالین میں چار کمپنیاں ہوتی ہیں، جن میں ہر سال شامل ہونے والے کیڈٹ کورسز یا جتھے کی نمائندہ کم از کم ایک پلاٹون موجود ہوتی ہے۔ پلاٹون کا حجم عموماً بیس کیڈٹ ہوتا ہے۔ اس طرح ایک کمپنی میں بیک وقت کم از کم چار سینئر اور جونیئر کیڈٹس کی پلاٹونیں ہوتی ہیں۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں 12 کمپنیاں ہیں، جو سب مشہور مسلمان جنگجوؤں اور کمانداروں کے نام سے منسوب ہیں۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں زیرِ تربیت پانچ کورسز ایک دوسرے کے متوازی چلتے ہیں۔

1- **پی ایم اے لانگ کورس:** پی ایم اے لانگ کورس لڑاکا اور لڑاکوں کی امداد کرنے والی آرمز اور سروسز میں باقاعدہ کمیشن کے لیے منتخب زیرِ تربیت افسران یا کیڈٹس کی تربیت کے لیے ہے۔ لانگ کورس کی مدت دو سال ہے، جس کو مزید چھ ماہ کی چار ٹرم یا مدتوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دو سال کی تربیت کے بعد کیڈٹ بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ پاس آؤٹ ہو جاتے ہیں۔

2- **پی ایم اے گریجویٹ کورس:** پی ایم اے گریجویٹ کورس پہلے سے ہی گریجویٹ یا بی اے کے فارغ التحصیل کیڈٹوں کی تربیت کے لیے ہے۔ یہ کیڈٹ، ٹیکنیکل گریجویٹ کورس کے کیڈٹوں کی طرح فوجی تربیت کے صرف ایک سال سے گزرتے ہیں، مگر بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ پاس آؤٹ ہوتے ہیں۔ نئی پالیسی کی وجہ سے گریجویٹ کورس بند کر دیا گیا ہے۔

3- **ٹیکنیکل گریجویٹ کورس (TGC):** جو امیدوار ایک انجینئر کے طور پر فوج میں شامل ہونا چاہتے ہیں، اس کورس کے لیے منتخب ہوتے ہیں۔ ان امیدواران کا فزکس، کیمسٹری اور ریاضی کے ساتھ تعلیم کا بارہ سالہ یا ایف ایس سی پری انجینئرنگ تک حصول ضروری ہے۔

4- **آرمی میڈیکل کورس (اے ایم سی) / مشترک یا انٹیگریٹڈ کورس:** اس کورس کے لیے اہلیت فزکس، کیمسٹری اور بائیولوجی کے ساتھ تعلیم کے بارہ سال یا ایف ایس سی پری میڈیکل کا حصول ہے۔ جو امیدوار ابتدائی اور جی ایچ کیو سلیکشن بورڈ ٹیسٹ میں کامیاب ہوں، وہ ایم بی بی ایس/ڈاکٹری کے لیے یا بیچلر آف ڈینٹل سرجری کے لیے آرمی میڈیکل کالج کو بھیجے جاتے ہیں جس کے بعد وہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کا کول میں بائیس ہفتوں کی بنیادی فوجی تربیت کے بعد بطور کپتان پاکستان آرمی میڈیکل یا ڈینٹل کور میں کمیشن کیے جاتے ہیں۔

5- **پی ایم اے لیڈی کیڈٹ کورس (LCC):** پہلا پی ایم اے لیڈی کیڈٹ کورس نومبر 2006ء میں شروع کیا گیا تھا۔ کورس ماسٹرز اور انڈر گریجویٹ تعلیم یافتہ خواتین کے لیے ہے، جو چھ ماہ کی تربیت سے گزر کر کپتان کے طور پر پاس آؤٹ ہوتی ہیں۔

☆☆☆

پرواز میں کوتاہی

یہ ایک پوش علاقہ ہے۔ میرا دفتر مین مارکیٹ میں واقع ہے۔ میرے دفتر کی کھڑکی مارکیٹ کی طرف کھلتی ہے جہاں سے میں بازار کی رونق اور لوگوں کی چہل پہل دیکھا کرتا ہوں۔ مارکیٹ میں ہر طرح کی دکانیں تھیں۔ کھانے پینے کی دکانیں، کپڑوں، جوتوں وغیرہ کی۔ میرا شوق لکھنا اور پڑھنا ہے لہٰذا سرکاری ملازمت کے بعد فارغ اوقات میں میں نے پبلشنگ کا کام شروع کر رکھا ہے۔

میں ایک مڈل کلاس گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ہمارا گھرانہ ایک پڑھا لکھا گھرانہ ہے۔ بچپن میں دادا اور دادی کی گود میں کھیلا کرتا تھا۔ دادی جان ایک لکڑی کے منقش تخت پوش پر بیٹھا کرتی تھیں۔ تہجد کے بعد فجر کی نماز تک تلاوت قرآن پاک کیا کرتی تھیں۔ میرے ابا جان بھی ان کے پاس کچھ دیر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ دادی جان انہیں بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس کراتی تھیں۔ دادی جان ایک موٹی سی کتاب ہاتھ میں پکڑے اکثر اشعار گنگنایا کرتی تھیں۔ خصوصاً ابا جان کو کچھ نہ کچھ اشعار ضرور سناتی تھیں لیکن ایک شعر وہ ابا جان کو ضرور سناتی تھیں۔

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

دادی جان کی تربیت کا اثر تھا کہ ابا جان نے ہمیشہ حلال رزق کمایا۔ مجھے اس شعر کی سمجھ نہ آتی تھی میرا ذہن ''پرواز کی کوتاہی'' پر اٹک جاتا تھا۔ دادی جان یہ شعر ابا جان کو سمجھانے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابا جان کو میں نے کبھی حرام کھاتے یا کماتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ دن پَر لگا کر اڑ رہے تھے۔ میں نے اپنی رسمی تعلیم ختم کی اور سرکاری ملازمت کرنے لگا۔ جب سرکاری ملازمت کا پہلا دن تھا تو دادی جان نے ترنم سے اقبال کا یہی شعر پڑھا۔

خود بخود میں سمجھ گیا کہ یہ شعر کیوں سنایا جا رہا ہے۔ والدین کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ ہمارا گھرانہ مالی لحاظ سے بہت زیادہ اچھا تو نہ تھا لیکن قلبی سکون اور اطمینان ہمیں میسر تھا۔

......☆......

اب میں اپنے دفتر میں کھڑا ہوں۔ میرا چھوٹا بیٹا پانچویں جماعت کا طالب علم ہے۔ وہ بھی اکثر میرے ساتھ یہاں آیا کرتا ہے۔ میں نے اپنے دفتر کی دیوار پر اقبال کا یہ شعر ''اے طائرِ لاہوتی......'' فریم کروا کر لگا رکھا ہے۔

''ابو جان! میں روز یہ شعر پڑھتا ہوں۔'' اس نے دیوار پر لگے فریم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے اس کا مطلب بھی سمجھایئے۔''

''جی بیٹا! ضرور سمجھاؤں گا۔''

......☆......

دن گزرتے رہے۔ میں معمول کے مطابق کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو کر سامنے مارکیٹ کی رونق دیکھا کرتا۔ بالکل سامنے والی

دکان کے تھڑے پر ایک آدمی قلفیاں لگانے لگا۔ اس کی قلفیاں بہت لذیذ تھیں۔ وہ صفائی کا بھی بہت خیال رکھتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی قلفیاں مشہور ہونے لگیں۔ اتفاق سے مجھے قلفیاں بہت پسند تھیں۔ ایک خاص بات جو میں نے محسوس کی کہ قلفی والا آدمی ایک خاص وقت میں قلفیاں لگایا کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ شاید قناعت اور توکل کا نور اس کے چہرے پر تھا۔ اگر وہ چاہتا تو زیادہ وقت بھی اپنے کام کو دے سکتا تھا۔ خیر میں بھی تقریباً روزانہ قلفی مزے لے کر کھاتا رہا۔ قلفی خالص کھوئے کی بنی ہوئی تھی اور خوب جمی ہوئی ہوتی تھی۔ مٹھاس کا تناسب بھی خوب تھا۔ مختصر یہ کہ اس کی قلفیوں کی لذت کا راز خالص دودھ اور کھوئے کی وجہ سے تھا۔

اس کا کاروبار اب بڑھنے لگا تھا۔ یہ رزق حلال کی برکت تھی۔ اب تھڑے کی جگہ ایک مناسب دکان نے لے لی تھی۔ ہاتھ بٹانے کے لیے کچھ لڑکے بھی رکھ لیے تھے۔ اب اس نے بادام والا میٹھا دودھ بھی لگانا شروع کر دیا تھا۔ دکان کے اندر ہی اس نے قلفیاں تیار کرنی شروع کر دی تھیں۔ اب تو گاہکوں کا رش بھی بڑھنے لگا، حتیٰ کہ گاہکوں کی قطاریں لگنا شروع ہو گئیں۔

ہم باپ اور بیٹا اب بھی قلفیاں بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ میں قلفی والے کا مکمل جائزہ بھی لیا کرتا تھا۔ وہ اپنے کام میں جتا رہتا تھا۔ اب رات گئے تک دکان کھلی رہتی تھی۔ وہ نوکروں کو ہدایات دیتا۔ کام بڑھ رہا تھا تو اس کی مصروفیت بھی بڑھنے لگی۔ اس کے چہرے کا اطمینان اب فکر کی جگہ لینے لگا تھا۔

میں اپنے مشاہدے میں گم تھا۔ اچانک میرا بیٹا آ گیا۔

''ابو جان سخت گرمی ہے۔ کچھ ٹھنڈا پلا دیجیے۔'' میرے بیٹے نے ماتھے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

میں نے چپڑاسی کو بادام والا ٹھنڈا دودھ اور قلفی لانے کو کہا۔ اس نے کچھ دیر بعد دونوں چیزیں لا کر میز پر رکھ دیں۔ ہم دونوں دودھ کے سپ اور قلفی کھانے لگے۔ ''ابو جان! کیا بات ہے، اب قلفی میں وہ مزا نہیں آ رہا جو پہلے تھا۔'' میرے بیٹے نے مجھے آگاہ کیا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے اتنی توجہ نہیں دی تھی۔ میرا بیٹا واقعی بہت ذہین تھا۔

اگلے دن یونہی عادتاً میں نے قلفی والے کی دکان کی طرف دیکھا۔ وہ قلفی بنانے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے دودھ کے کڑاہے میں دودھ ڈالا۔ نیچے آگ بھی جلائی اور اسے پکانے لگا۔ اس نے ایک پانی کی بالٹی بھری اور کڑاہے میں انڈیل دی اور دوبارہ نیچے ملا کر دودھ پکانے لگا۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ خیر میں فوراً کھڑکی سے ہٹ گیا۔

اب اس کے کاروبار کی حالت یہ ہوئی کہ دکان پر رش کم ہونے لگا۔ قلفی کا ذائقہ پہلے جیسا نہ تھا۔ قلفی والے کے چہرے پر پہلے جیسا اطمینان اور سکون بھی غائب تھا۔ آج بھی میں اپنے بیٹے کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چپڑاسی کو دودھ اور قلفی لانے کو کہا۔ ہم دونوں قلفی کھانے لگے۔

''بیٹا! آج قلفی کا ذائقہ کیسا ہے؟'' میں نے اپنے بیٹے سے سوال کیا۔

''ابو جان! پہلے جیسا ذائقہ تو نہیں ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''بیٹا! تم پوچھا کرتے تھے اقبالؒ کے شعر میں طائر لاہوتی اور پرواز میں کوتاہی کا کیا مطلب ہے تو بیٹا یہ قلفی اس کا جواب ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''طائر لاہوتی انسان کو کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رزق حلال کا حکم دیا ہے۔ حلال رزق میں محنت، صبر اور توکل کرنا پڑتا ہے اور انسان کو اطمینان و سکون جیسی انمول دولت مل جاتی ہے۔ جب توکل کی جگہ ہوس لے لیتی ہے تو رزق میں کمی آتی ہے۔ لالچ انسان کو بے ایمانی اور بددیانتی پر اکساتا ہے۔ نتیجتاً انسان کا رزق گھٹنے لگتا ہے۔ قلبی سکون اور چہرے کا نور جاتا رہتا ہے۔ اب قلفی والے کی مثال دیکھ لو۔ جب تک یہ شخص خالص دودھ استعمال کرتا رہا، دیانت سے قلفی بناتا رہا، اس کی دکان پر گاہکوں کی قطاریں لگ گئی تھیں۔ جیسے ہی دولت کی ہوس اس پر غالب آئی، شیطان نے اسے بددیانتی اور ملاوٹ پر اکسایا تو اس کا رزق گھٹنے لگا اور اب دیکھو اس کی دکان ویران ہے۔ اکا دکا گاہک آ جاتا ہے۔ بیٹا! اسے کہتے ہیں پرواز میں کوتاہی یعنی حرام طریقے سے رزق کمانا۔ حرام رزق دولت کو تو بڑھا دیتا ہے لیکن گناہ کی دلدل میں بھی پھینک دیتا ہے۔ سکون اور اطمینان بھی چھین لیتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے انسان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ حرام رزق کمانے سے موت بہتر ہے جو انسان کو اشرف المخلوقات کے اعلیٰ مرتبے سے ذلت کی پستیوں میں پھینک دیتا ہے۔''

میں نے اپنی بات ختم کی اور کرسی سے سر ٹکا لیا۔ میرا بیٹا اٹھا، کھڑکی کا پردہ اٹھا کر قلفی والے کی طرف دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر دعا کی کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے بھی حلال رزق کمانے کی توفیق دے۔

☆☆☆

جھیل سیف الملوک: خوب صورت ترین جھیل کی اس فہرست میں سب سے پہلا نمبر جھیل سیف الملوک کو حاصل ہے۔ یہ جھیل سیف الملوک وادیٔ کاغان کے اختتام اور وادیٔ ناران سے انتہائی قریب ہے۔ یہ پاکستان کی بڑی جھیلوں میں سے ایک ہے۔ اس جھیل کا شمار پاکستان کی بلند ترین جھیلوں میں ہوتا ہے اور یہ 3224 میٹر کی بلندی پر واقع ہے۔

کینجھر جھیل: یہ جھیل کلری کے نام سے بھی جانی جاتی ہے۔ یہ پاکستان کی دوسری صاف و تازہ پانی کی جھیل ہے۔ یہ کراچی سے تقریباً122 کلومیٹر کی دوری پر ضلع ٹھٹھہ میں واقع ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد یہاں پر سیر کرنے آتی ہے۔ اس جھیل میں لوگ مچھلیاں پکڑتے، کشتی سے سفر کرتے اور تیراکی کرتے ہیں۔

بنجوسہ جھیل: یہ ایک مصنوعی جھیل ہے جو کہ سیاحوں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ راولا کوٹ سے نزدیک آزاد کشمیر کے ضلع باغ میں واقع ہے۔ یہ جھیل سطح سمندر سے64.99 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس جھیل کے چاروں طرف خوب صورت ہریالی ہے اور یہی اس جھیل کی خوب صورتی کا راز ہے۔

کرمبر جھیل: کرمبر جھیل خیبر پختونخواہ اور گلگت بلتستان کے درمیان واقع ہے اور یہ پاکستان کی دوسری جب کہ دُنیا کی 31 ویں بلند ترین جھیل ہے اور 14121 فٹ کی بلندی پر واقع یہ جھیل حیاتیاتی طور پر ایک فعال جھیل ہے۔ اس جھیل کی گہرائی تقریباً55 میٹر، لمبائی تقریباً4 کلومیٹر اور چوڑائی 2 کلومیٹر ہے۔

رش جھیل: یہ جھیل پاکستان کی بلند ترین جھیل ہے اور یہ 5098 میٹر کی بلندی پر رش پری نامی چوٹی کے نزدیک واقع ہے۔ یہ دُنیا کی 25 ویں بلند ترین چوٹی پر واقع جھیل ہے۔ یہاں تک رسائی کے لیے گلیشئر کے راستوں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے اور اس کے راستے نہایت ہی دلفریب مناظر دکھاتے ہیں۔

ست پارہ جھیل: گلگت بلتستان میں واقع یہ ایک نہایت ہی خوب صورت قدرتی جھیل ہے اور اس کا حسن دیکھ کر انسان کی سانسیں تھم سی جاتی ہیں۔ یہ قدرتی جھیل اسکردو سے قریب ہے۔ یہ پاکستان کی سب سے لمبی صاف و شفاف پانی کی جھیلوں میں سے ایک ہے اور 2.5 کلومیٹر سے زائد رقبے پر پھیلی ہوئی ہے جب کہ یہ جھیل 8650 فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

دودی پت سر جھیل: یہ جھیل دودی پٹ کے نام سے بھی جانی جاتی ہے اور وادیٔ کاغان کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ اس جھیل کا شمار پاکستان کی خوب صورت جھیلوں میں کیا جاتا ہے۔ یہ جھیل برفیلے پہاڑوں کے درمیان میں واقع ہے۔ اس جھیل پر صرف موسم گرما میں جایا جا سکتا ہے کیوں کہ اس مقام تک رسائی سال کے 4 ماہ یعنی جون سے ستمبر تک ممکن ہوتی ہے۔

شنگریلا جھیل: اس جھیل کو پاکستان کی دوسری خوب صورت ترین جھیل کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ کاچورہ جھیل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ یہ جھیل شنگریلا ریزورٹ کا ایک حصہ ہے اور مقبول ترین سیاحتی مقام ہے۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10 / نومبر 2014ء ہے۔

اکتوبر 2014ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا (عمیر علی، راول پنڈی)
- خود تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے (انمول قندیل، اسلام آباد)
- ترے مرنے کی خواہش نے ہمیں بے موت مارا (ماہین صباحت، لاہور)
- جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے (ارفع اختر، راول پنڈی)
- صحت مند ہونے کا نقصان / خودکشی کرنا نہیں آسان (عائشہ شہباز، وہاڑی)